ایک تاریخی دستاویز

پاکستان کیا ہے؟
اور
کیسے بنے گا؟؟؟



رحمۃ اللہ علیہ
مولانا محمد عبدالستار خان نیازی

مجاہد ملت فاؤنڈیشن پاکستان

پاکستان کیا ہے؟
اور
کیسے بنے گا؟؟؟

مولانا محمد عبدالستار خان نیازیؒ

☆مُجاہدِ ملت فاؤنڈیشن پاکستان☆

لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝

[illegible]

(پارہ:۳۰ سورہ الکفرون:۲تا۶)

☆

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ. (پارہ:۳ سورہ آل عمران:۸۵)

(اگر کوئی شخص اسلام کے سوا کسی اور دین سے محبت رکھے تو وہ دین اس سے قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت وہ شخص زیاں کاروں میں سے رہے گا)۔

☆

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا!

(اقبالؒ)

★★★

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بیادِ عزیز

ضیغم اسلام بطل حریت مجاہد ملت حضرت مولانا محمد عبدالستار خاں نیازی رحمۃ اللہ علیہ

سلسلہ اشاعت نمبر ۱۶

نام کتاب ---------- ''پاکستان کیا ہے؟ اور کیسے بنے گا؟''

مصنف ---------- مولانا محمد عبدالستار خان نیازیؒ

صفحات ---------- ۱۶۸

سال اشاعت ---------- ستمبر ۲۰۱۱ء

تعداد ---------- ایک ہزار

ہدیہ ---------- ''دعائے خیر بحق معاونین فاؤنڈیشن''

ضروری نوٹ: بیرونی حضرات چالیس روپے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر طلب کریں۔
ٹکٹ کے بغیر کتاب ارسال نہیں کی جائے گی۔

کمپوزنگ: افضال کمپیوٹر کمپوزنگ سنٹر تھانہ صدر روڈ قصور
0322-7179662

---------- ناشر ----------

مجاہد ملت فاؤنڈیشن، برج کلاں ضلع قصور (پاکستان)

پوسٹ کوڈ نمبر ۵۵۰۵۱
0306-4469496

فہرست مضامین

حرفِ صادق

حضرت مولانا محمد عبدالستار خان نیازی رحمۃ اللہ علیہ جنہیں اُن کے ساتھی اور عقیدت مند "ضیغمِ اسلام"، "بطلِ حریت"، "مردِ حق مردِ غازی"، "قوم کی عزت، قوم کی شان" اور "مجاہدِ ملت" کے القابات سے یاد کرتے ہیں، عمر بھر ایک سربکف مجاہد کا کردار ادا کرتے رہے۔ اُن کے کردار میں قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے اوصاف جھلکتے نظر آتے تھے۔ بے شک وہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کی جماعت کے بچھڑے ہوئے فرد تھے۔

بہ آب وتابے کہ فطرت بخشد
درخشم چو برقے بہ ابرِ سیاہ (اقبالؒ)

☆

امیرِ شہر رہا اپنی ذات میں محصور
فقیرِ راہ نشیں مرجعِ عوام رہا

میں جب بھی کسی انقلابی شاعر کا یہ شعر پڑھتا ہوں تو مجھے یک لخت، بیساختہ اور بلا جھجک مجاہدِ ملت حضرت مولانا محمد عبدالستار خان نیازی علیہ الرحمہ یاد آجاتے ہیں...... ہر معاشرے میں ایسے افراد ہر دور اور ہر عہد میں موجود ہوتے ہیں جو دُنیاوی طور پر کسی حیثیت کے مالک نہیں ہوتے، جاگیردار نہیں ہوتے، سرمایہ دار نہیں ہوتے اور نہ ہی سرکارِ دوالامدار کی عنایاتِ خسروانہ سے کسی منصب پر فائز ہوتے ہیں لیکن اُس کے باوجود وہ اپنے اعلیٰ کردار اور عوام دوست صفات کی بدولت عوام الناس کے دلوں میں راج کرتے ہیں، جب وہ اس دُنیا میں نہیں رہتے تو اُن کی یادیں لوگوں کے دلوں میں تازہ رہتی ہیں، صدیاں گزر جاتی ہیں لیکن خلقِ خدا کے دلوں سے اُن کی یادوں کے نقوش محو نہیں ہونے پاتے۔ اُن کی عمریں جبر واستبداد، ظلم واستحصال اور ناانصافی وحق تلفی کے خلاف جہاد کرتے گزر جاتی ہیں، اس لئے ایسے مجاہد صاحبِ حیثیت طبقات اور حکومت پرست مذہبی "کٹھ ملاؤں" کی نظر میں سدا معتوب رہتے ہیں۔ بقول احمد فراز،

امیرِ شہر کی نظروں میں مفسد و سرکش
خطیبِ شہر کے خطبوں میں کافر و مرتد

لیکن یہ مردانِ درویش اُن تمام مخالفانہ اقدامات سے بے پرواہ ہو کر اپنی عمریں، اپنی زندگیاں اور اپنی تمام تر مساعی اپنے مشن کی تکمیل میں اس طرح صرف کر دیتے ہیں کہ

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

☆

حضرت مجاہدِ ملت رحمۃ اللہ علیہ بھی ایسے عوام دوست، بے لوث اور بے ریا مجاہدوں میں سے ایک تھے جنہوں نے تمام عمر غلبۂ دین، آزادی، جمہوریت اور حقوقِ انسانی کی جنگ لڑی، ہر آمر کے خلاف نعرۂ تکبیر بلند کیا، قید وبند کی صعوبتوں سے نبرد آزما ہوئے، قاتلانہ حملوں کی زد میں آئے مگر اُن کی زبان پر ہمیشہ یہی رہا کہ

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

☆

زمانہ نے اُن کی کوئی قدر کی یا نہ کی، اُن کی عظمت وسطوت کا اعتراف کیا یا نہ کیا مگر تاریخ اُن کی مرہونِ منت اور ممنونِ احسان رہے گی۔ نسلِ انسانی کی یہ وہی قبیل ہے جو درست طور پر اپنے مقصدِ حیات کی صداقت پر یقین رکھتے ہوئے نیکی اور اچھائی کی نہ فنا ہونے والی دُنیا میں زندہ رہتی ہے۔ ایسے لوگوں کا دل ودماغ شک وشبہ سے پاک، صاف اور شفاف ہوتا ہے۔ اب جو دورِ جدید شروع ہوا تو اس دور کی اپنی ہی رت نئی جدید طرزیں اور ادائیں ہیں، جن کی منظر کشی بڑے درد اور کرب کے ساتھ محسن بھوپالی نے اپنے اس قطعہ میں کی ہے۔

تلقینِ اعتماد وہ فرما رہے ہیں آج — راہِ طلب میں خود جو کبھی معتبر نہ تھے
نیرنگیٔ سیاستِ دوراں تو دیکھئے — منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

☆

حضرت مجاہدِ ملت علیہ الرحمہ کی وسعتِ معلومات کا یہ عالم تھا کہ مذہب سے لے کر سیاست تک، ادب سے لے کر فلسفہ وحکمت تک، قرآن سے لے کر تاریخ وسیر تک کوئی ایسا موضوع نہیں جس پر اُنہوں نے تحریر وتقریر میں عالمانہ اور فاضلانہ اظہارِ خیال نہ کیا ہو اور اس سے انکار ممکن نہیں کہ مذہبی سیاست کو جتنی معلومات، طاقتیں اور وسعتیں انہوں نے بخشی ہیں وہ اپنی نظیر نہیں رکھتیں۔

کروڑوں رحمتیں ہوں حضرتِ نیازی کی تربت پر
کوئی صدیوں میں ایسا صاحبِ ارشاد ہوتا ہے

☆

حضرت مجاہد ملت قدس سرہٗ العزیز کا شمار اُن اکابرینِ ملتِ اسلامیہ میں ہوتا ہے جنہوں نے علمی و فکری، سیاسی و دینی اور عملی و تحریکی حوالے سے نہ صرف برِصغیر بلکہ عالمِ اسلام کی نہایت ہی نازک وقت میں رہنمائی فرمائی۔ ملتِ اسلامیہ کو جراتِ افکار کی حقیقت سے آگاہی بخشی اور فکرِ اسلامی کی پاسداری کا فریضہ انجام دیا۔ گفتار و کردار کے اس مجاہد نے اپنے اسلامی فکر و فلسفہ کی بنا پر تحریکِ پاکستان کے دوران ایک ایسا انقلاب برپا کر دیا کہ شرق و غرب اور شمال و جنوبِ برصغیر کے لوگ آپ کے افکار سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ آج پوری دُنیا میں اسلامی نظام کے نفاذ اور اسلامی اقدار کی پاسداری کی جب بات ہوتی ہے تو حضرت مجاہد ملت ؒ کی کتابوں "خلافتِ پاکستان"، "مسودۂ آئینِ خلافتِ پاکستان"، "پیغمبرِ اسلام (مقامِ رسول ﷺ عقل کی روشنی میں)"، "اتحاد بین المسلمین" اور "پاکستان کیا ہے اور کیسے بنے گا؟" میں پھیلے ہوئے افکار و نظریات کو رہنما اصول بنایا جاتا ہے۔

اب جس کے جی میں آئے وہی روشنی پائے
ہم نے تو دل جلا کے سرِ عام رکھ دیا

☆

تحریکِ پاکستان میں حضرت مجاہد ملت علیہ الرحمہ کا کردار روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ پنجاب میں قائداعظمؒ کی تائید و حمایت میں سب سے پہلی اور موثر آواز حضرت مجاہد ملتؒ اور اُن کے مخلص اور سرفروش رفقاء کی تھی۔ ۳۲-۱۹۳۱ء میں جب سر سکندر حیات خان وزیرِاعظم پنجاب، اپنے صوبہ میں مسلم لیگ کے قدم جمنے نہیں دیتے تھے اور طرح طرح کی سازشوں سے اسے خاسر و نامراد بنانے پر تلے ہوئے تھے تو یہ حضرت مجاہد ملتؒ اور اُن کے سرکفن ساتھی ہی تھے جنہوں نے سر سکندر کو چیلنج کیا اور پنجاب میں اسلامیانِ ہند کے دلوں کی دھڑکن مسلم لیگ کے باقاعدہ قیام و استحکام کی راہ ہموار کی اور قائداعظمؒ سے ملاقاتیں کر کے پنجاب میں اُن کے دوروں کا اہتمام و انصرام کیا اور اس طرح مسلم لیگ کو قبولیتِ عامہ کا شرف حاصل ہوا۔

☆

پھر جُوں جُوں مسلم لیگ حصولِ پاکستان کے نصب العین کی طرف بڑھ رہی تھی، معاندین کی سازشوں، مخالفتوں اور رکاوٹوں میں تیزی آ رہی تھی، اُدھر انگریز، ہندو اور سکھ مگدم پاکستان کے خواب کو شرمندۂ تعبیر ہونے کے تصور سے لرزاں تھا اور حضرت قائداعظمؒ اور مسلم لیگ کے لئے نت نئے مسائل کھڑے کر کے اپنی ازلی و ابدی خباثت کا خوفناک مظاہرہ کر رہا تھا۔

یہ تھے حالات و واقعات جب ۱۹۴۵ء میں اسلامیانِ ہند کی ذہنی، فکری، تاریخی، سیاسی اور دینی رہنمائی کے لئے حضرت مجاہد ملتؒ نے اپنے جگری دوست اور ساتھی میاں محمد شفیع (م ش) کے ساتھ مل کر "پاکستان کیا ہے اور کیسے بنے گا؟" کے نام سے ایمان افروز اور باطل سوز کتاب رقم فرمائی اور اسی سال ہی زیورِ طباعت سے آراستہ کر کے مسلم امّہ کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔ اس کتاب میں "پاکستان ہے کیا"؟، "بنے گا کیسے"؟ اور "ہوگا کیا"؟ کے زیرِ عنوان بڑی دانشمندی، دیدہ وری اور جگر سوزی سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ ۷۰۷ء سے ۱۹۵۷ء تک کی تاریخ پر ناصحانہ، ناقدانہ اور عالمانہ انداز میں نظر ڈالی گئی اور بتایا گیا ہے کہ مملکتِ خداداد پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد ہم کیسے اسے کامیابی و کامرانی کے ساتھ چلائیں گے اور اس کو دُنیا کی سب سے بڑی اسلامی، جمہوری، فلاحی اور ناقابلِ شکست و ریخت ریاست بنائیں گے؟۔

خدا کرے کہ میری ارضِ پاک پر اُترے — وہ فصلِ گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو
یہاں جو پھول کھلے وہ کھلا رہے صدیوں — یہاں خزاں کو گزرنے کی بھی مجال نہ ہو

☆

قیامِ پاکستان کے بعد حضرت مجاہد ملت علیہ الرحمہ اپنے مشن کی تکمیل، مقصد کے حصول اور ریاست کی فوز و فلاح کے لئے کمربستہ، پابرکاب اور جادہ پیما رہے، قید و بند کی تکلیفوں، قاتلانہ حملوں کی کلفتوں اور تختۂ دار کی اذیتوں سے نبرد آزما رہے۔ اُن کے پائے استقلال میں ذرہ بھر بھی لغزش و لرزش نہ آئی مگر افسوس کہ لادینی قوتوں اور مصلحت پسند حکومتوں نے اُن کا راستہ کھوٹا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور زندگی بھر جد و جہد کرنے کے بعد ۲/مئی ۲۰۰۱ء کو ان کا قطرۂ حیات بحرِ ابدیت سے وصال آشنا ہو گیا۔

خوشی کی رُت ہو کہ غم کا موسم! نظر اُسے ڈھونڈتی ہے ہر دم
وہ بوئے گل تھا کہ نغمۂ جاں، مرے تو دل میں اُتر گیا وہ
وہ ہجر کی رات کا ستارہ، وہ ہم نفس، ہم سخن ہمارا
سدا رہے اُس کا نام پیارا، سُنا ہے کل رات مر گیا وہ

☆

ضرورت تھی کہ حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کی اس نادر و نایاب کتاب کو شائع کر کے عوام و خواص کو عموماً اور نژادِ نو کو خصوصاً اُن کے افکار سے رُوشناس کرایا جائے تاکہ شاید کوئی اُن کے مشن کی تکمیل اور اُن کے مقصد کے حصول کے لئے اپنی زندگی، اپنی خدمات اور اپنی صلاحیتیں وقف

کرے۔

تیز رکھیو سر ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آ نکلے کوئی آبلہ پا میرے بعد

اور پھر یوں اس خزاں رسیدہ گلستان میں بہار آ جائے۔

قارئین کرام کو یہ معلوم کر کے نہایت ہی خوشگوار حیرت کا سامنا کرنا ہوگا کہ یہ نادر و نایاب کتاب کیسے حاصل ہوئی۔ ہوا یوں کہ ۹۔ دسمبر ۱۹۸۳ء بروز پیر جب یہ کمترین برادر حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کے آستانہ عالیہ ۲۲۔ اویس قرنی روڈ، اسلام پورہ، لاہور بسلسلہ قدم بوسی حاضر ہوا تو آپ نے ازرہِ لطف و کرم اپنے ذاتی نسخہ سے سرفراز فرمایا۔ تب یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک دن یہ ارژنگ میرے زیر اہتمام زیورِ طباعت سے آراستہ و پیراستہ ہو کر اپنے درخشاں ماضی کو فراموش کردہ نوجوانوں کے لہو میں حرارت کا باعث بنے گا اور شاید اس طرح عقابی رُوح کا سامان بھی ہو جائے گا کیونکہ

عقابی رُوح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اُس کو اپنی منزل آسمانوں میں

☆

دلِ دانا اور چشمِ بینا رکھنے والے شاید اس نکتہ کو سمجھ گئے ہوں اور اس راز کو پا گئے ہوں کہ اس عنایت کی غایت کیا تھی۔ واہ رے درویش دانا! میں تیری بصیرت، فراست اور عظمت کے قربان جاؤں۔

من چہ در پائے تو ریزم کہ سزائے تو بود
سر نہ چیزیست کہ شائستہ پائے تو بود

☆

محبِ گرامی قدر، فدائے مجاہد ملتؒ فخرِ سیالکوٹ جناب ڈاکٹر خالد سعید شیخ اور آبروئے علم و ادب، مداحِ مجاہد ملتؒ جناب پروفیسر سیف اللہ خالد سابق استاذ شعبہ اُردو اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور نے اس کتاب کی جلد اشاعت و طباعت کے لئے مجھے بار بار اُکسایا اور مہمیز لگائی۔ وارثِ فکرِ اکابرِ نقشبندیہ، ناشرِ تعلیماتِ مجددیہ محبی ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس شعبہ عربی گورنمنٹ جی سی یونیورسٹی لاہور نے اپنی خصوصی دُعاؤں سے نوازا۔ تب کہیں جا کر یہ ارمغانِ فکر و سیاست اور دانش و حکمت طباعت کی منزلوں سے گزر کر پیارے معاونین اور قارئین کی نذر

ہوا۔ لیجئے! اسے پڑھیے اور حضرت مجاہد ملتؒ کی بالغ نظری، حب الوطنی اور روشن فکری کی داد دیجئے بلکہ سلام کیجئے اور وطن عزیز کی بقا اور سلامتی کے لئے کمربستہ ہو جایئے۔

نہیں ہے نااُمید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

☆

میں شکرگزار ہوں وطن عزیز کے نامور مذہبی سکالر، بزرگ اہل قلم اور معروف مصنف حضرت صاحبزادہ سید محمد فاروق القادری دامت برکاتہم عالیہ زیب سجادہ گڑھی اختیار خاں ضلع رحیم یار خاں کا کہ انہوں نے میری درخواست کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے کتاب ہذا کے بارے میں گرانقدر تاثرات سے نوازا جو زینتِ کتاب ہیں۔ اللہ کریم جل شانہٗ اُن کا سایہ ہمارے سر پر تادیر سلامت رکھے۔

اور شکریہ ادا کرتا ہے مجھے ملک کے ممتاز دانشور، ماہر پاکستانیات اور نظریۂ پاکستان کے پرستار جناب ڈاکٹر سرفراز حسین مرزا ریسرچ سکالر نظریۂ پاکستان فاؤنڈیشن لاہور کا کہ اُنہوں نے نہایت ہی فاضلانہ "پیش لفظ" تحریر فرما کر کتاب کی غرض و غایت بڑے احسن انداز میں بیان کر کے بڑا احسان فرمایا ہے، جس سے حضرت مولانا نیازی رحمۃ اللہ علیہ کے نظریات و افکار کو سمجھنے میں آسانی ہو گئی ہے۔ خداوند قدوس اُن کو اجرِ عظیم سے نوازے اور اُن کی مساعی، صحت اور خدمات میں برکت عطا فرمائے۔ (آمین)

محمد صادق قصوری
معتمد اعزازی
مجاہد ملت فاؤنڈیشن
بُرج کلاں ضلع قصور۔ ۵۵۰۵۱
۷/ ستمبر ۲۰۱۰ء، منگوار

﴿پاکستان کی کہانی ــــــــــــــــــــــــــ

پیکرِ عزیمت مجاہد ملت مولانا عبدالستار خاں نیازی کی زبانی﴾

(سید محمد فاروق القادری صاحب سجادہ نشین آستانہ عالیہ گڑھی اختیار خاں ضلع رحیم یار خاں)

زباں پہ بار خدایا! یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

پیکرِ عزیمت، نا آشنائے رخصت، مجسمہ عزم و ہمت، سیدنا امام حسینؓ اور امام احمد بن حنبلؒ کے مسلک کے سچے پیروکار مولانا محمد عبدالستار خان نیازی کا نام لینے سے قبل ذرا ٹھہریئے! مجھے پہلے لغت کی کتابوں سے باطل سے مصالحت، مفاہمت، موافقت، مداہنت، حق کے بارے میں لچک اور نرمی ایسے تمام الفاظ کھرچ لینے دیجئے کہ یہ سارے رویے مولانا کی زندگی کو چھو کر بھی نہیں گزرے تھے، مولانا کی ساری زندگی نظیری کے اس شعر کی تصویر رہی:

گریز داز صفِ ماہر کہ مردِ غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

☆

شخصیات کے بارے میں میرا نظریہ "آں کہ یافتہ نمی شود آنم آرزوست" کا سا ہے۔ بے جا عقیدت، فرضی تصورات اور رائی کو پہاڑ بنا کر دکھانے کے مرض سے بحمداللہ بڑی حد تک میں محفوظ ہوں مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ دنیا مجموعۂ کمالات لوگوں سے خالی ہے، جلوت و خلوت میں تضاد، ذاتی مفاد، دباؤ، خود غرضی اور اقتدار کی ہوس ایسے معاملات ہیں جہاں بڑے بڑے نامور لوگ لڑکھڑا گئے ہیں۔ کسی کے پاس علم و فضل زیادہ ہے، کوئی نوافل زیادہ ادا کرتا ہے، کسی کے ہاں سال میں دو عمرے کرنا ضروری ہیں۔ یہ ان لوگوں کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں جو حق کی سربلندی کے لئے پھانسی کے پھندے کو چوم کر گلے لگاتے اور کال کوٹھڑیوں کو آباد کرتے ہیں اور اُن کا نعرۂ مستانہ ہمیشہ یہ رہتا ہے:

کیا عشق نے سمجھا ہے کیا حسن نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

☆

میں اپنے تجربے اور مختصر شعوری زندگی میں اسی معیار کے اعتبار سے دیکھتا ہوں تو تین شخص مجھے بھولے سے نہیں بھولتے

تختِ کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

اس دورِ تہی مایہ اور زمانۂ قحط الرجال میں میرے اپنے تعلق، ذاتی مشاہدے اور تجربے کے مطابق وہ تین افراد یہ ہیں (اس کا مقصد یہ نہیں کہ اس دور میں صرف یہی حضرات تھے، میں اپنے حوالے سے بات کر رہا ہوں) بطل حریت مولانا محمد عبدالستار خان نیازی، اسلام کے مرد مومن مولانا محمد ابراہیم علی چشتی اور مرد قلندر میر محمد امین خاں کھوسہ۔

☆

سراب کے پیچھے بھاگنے والی نئی نسل کو کسی اور مٹی سے بنے ہوئے ان لوگوں کا صحیح تعارف کرایا جائے تو شاید وہ یقین ہی نہ کریں کہ اس قسم کے لوگ بھی اس دھرتی پر موجود رہے ہیں۔ کیا خوب فرمایا ہے حضرت اقبالؒ نے ؎

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں

☆

آج "مولانا" کے لفظ سے بظاہر جس ہلکے پن، تنگ نظری، کم علمی (معذرت کے ساتھ) مفاہمت، مصالحت، عزیمت کی بجائے رخصت کا تاثر اُبھرتا ہے، اس لحاظ سے "مولانا نیازی" اور "مولانا محمد ابراہیم علی چشتی" کو "مولانا" کہنا یا سمجھنا پرلے درجے کی ناواقفیت اور ناانصافی ہے۔ اگرچہ "مولانا" کا لفظ ڈاکٹر (پی ایچ ڈی) سکالر، دانشور، مفکر اور محقق سے بلند مرتبہ اور اِن سب کا جامع ہے اور خود ایم ابراہیم علی چشتی (مولوی محمد ابراہیم علی چشتی) اور مولانا عبدالستار خان نیازی اپنے نام کے ساتھ "مولانا" کا لفظ پسند کرتے تھے۔

☆

پاکستان کا مطالبہ کیوں ہوا؟ اسے اس قدر پذیرائی کیوں ملی اور اس کے محرکات اور اسباب کے بارے میں آج بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں آ رہی ہیں، لے دے کے تان اسی پر آ کر ٹوٹتی ہے کہ اس مطالبے کا تعلق مذہب، مذہبی نظریے، یا اسلامی حکومت سے نہیں تھا۔ اس کی تائید میں قائداعظم محمد علی جناحؒ کے ایک آدھ بیان کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے اور ان کے

سینکڑوں اُن بیانات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جس میں اُنہوں نے نئی اسلامی مملکت کے بنے بنائے دستور قرآن مجید کا تذکرہ کیا ہے۔ دوسری طرف چند کانگریسی علماء کے کردار کو اس شدت کے ساتھ دہرایا جاتا ہے گویا سارا مذہبی طبقہ اس کا مخالف تھا، تاریخ کے ساتھ اس قدر سنگین مذاق یا اس سے بے خبری کو کیا نام دیا جائے۔۔۔ ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے۔

☆

پاکستان کے حق میں برصغیر کے کونے کونے میں ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۶ء تک ''آل انڈیا سُنّی کانفرنسیں''، برصغیر کے سارے رُوحانی خانوادے، سوادِ اعظم اہلِ سُنّت وجماعت کے نمائندہ تمام علمائے کرام، سندھ اسمبلی سے پاکستان کے حق میں قرارداد منظور کرانے والے پیر بھر چونڈی شریف، سرحد کے پیر صاحب مانکی شریف اور پیر صاحب زکوڑی شریف، فخرِ ملت مولانا عبدالحامد بدایونی، امیرِ ملت پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری، مولانا محمد عبدالستار خان نیازی، مولانا محمد ابراہیم علی چشتی کی آبِ زر سے لکھی جانے والی جدوجہد کس کھاتے میں گئی؟

☆

مرعوب ذہن اور معذرت خواہانہ طرزِ عمل کے حامل حضرات کے نزدیک اسلام کا نعرہ برصغیر کے کروڑوں لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر تو جمع کر سکتا تھا مگر یہ کسی نظامِ حکومت کے قابل نہ تھا۔ فاعتبروا یااولی الابصار.........

☆

ایک دفعہ ایک معروف سابق بیوروکریٹ نے مجھے گفتگو کے دوران کہا کہ قائداعظمؒ نے اسلام اسلام کا نعرہ مولویوں اور مذہبی طبقے کو بیوقوف بنانے کے لئے لگایا تھا، میں نے کہا یہ تو کوئی انتہائی دوغلا آدمی کر سکتا ہے جبکہ جناحؒ کے دشمن بھی تسلیم کرتے ہیں کہ وہ اکل کھرے، صاف گو اور مخلص لیڈر تھے۔

☆

صاف اور سیدھی بات ہے کہ جن لوگوں نے پاکستان بنایا وہی صحیح طور پر بتا سکتے ہیں کہ پاکستان کیوں بنایا گیا؟ اور یہی نامور لوگ پاکستان کے حقیقی خیر خواہ ہو سکتے ہیں اس لئے کہ انہوں نے انگریز ایسی جہانگیر اور جہاندار قوت سے ٹکر لے کر پاکستان کی خاطر قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔

☆

ہماری بدقسمتی کا آغاز پاکستان بننے کے فوراً بعد ہو گیا، پاکستان بنانے والوں نے یہ ملک صرف نمازیں پڑھوانے اور روزے رکھوانے کے لئے نہیں بنوایا تھا، اُن کے پیشِ نظر ایک ایسی فلاحی ریاست کا تصور تھا جہاں وسائلِ رزق سب کے لئے، عدل وانصاف ہر شخص کے لئے، علاج معالجے اور جان ومال، عزت وآبرو کا تحفظ ہر شہری کے لئے ریاست کی ذمہ داری تھی، یہاں وجہِ عزت سرمایہ داری وجاگیرداری نہیں بلکہ اعلیٰ اخلاقی اوصاف، دیانت، امانت، تقویٰ اور خدا ترسی ہوں۔ چنانچہ مجاہدِ ملت مولانا محمد عبدالستار خان نیازی نے ''منشورِ خلافتِ پاکستان'' میں ''امتناعِ فرعونیت''، ''امتناعِ قارونیت'' اور ''امتناعِ یزیدیت'' کے عنوانات میں انہیں انتہائی خوبصورتی اور مہارت سے واضح کر دیا ہے۔

☆

مولانا نیازی نہ ابلۂ مسجد تھے اور نہ تہذیبِ حاضر کے فرزند، وہ ''فکرِ اقبالؒ'' کی چلتی پھرتی تصویر تھے، انہیں علامہ اقبالؒ کا سارا کلام ازبر تھا اور وہ اس خوبصورتی سے علامہ کے اشعار پڑھتے کہ گویا یہ شعر اسی موقع کے لئے کہا گیا ہے۔ مولانا نیازی کا عزم وحوصلہ اور اُن کے عزائم افلاک سے بلند، پہاڑوں سے مضبوط اور فولاد سے سخت تھے۔ یہ شعر ایسے ہی لوگوں کے لئے کہا گیا ہے۔

لہٗ ھمم لا منتھیٰ لکبارھا
وھمتہ الصغریٰ اجل من الدھر

(اُن کے بڑے عزائم کی تو کوئی انتہا ہی نہیں، اُن کا چھوٹا عزم وارادہ بھی زمانے سے بڑا تھا)۔

☆

مولانا نیازی پاکستان بنانے والوں میں سے تھے۔ وہ فنا فی الپاکستان تھے مگر اس لئے کہ اُن کے نزدیک پاکستان دُنیا میں خلافتِ راشدہ کی طرز پر ایک ایسی انوکھی فلاحی ریاست ہوگی جو دُنیا کے لئے ماڈل بنے گی۔ اے بسا آرزو کہ خاک شُد۔

☆

جدید تعلیم یافتہ طبقے نے پاکستان کا جو حشر کیا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ اس طبقے نے پاکستان کو نہ صرف اُس کی منزل سے دُور کیا، بلکہ خود منزل کو ژولیدہ فکری کے ذریعے خواب پریشان کرنے میں اب تک مصروفِ عمل ہے۔ اسے مالِ مفتوحہ سمجھ کر لوٹا، یہاں لوٹ کھسوٹ، رشوت، بددیانتی، لاقانونیت کی ایسی روایتیں قائم کیں جنہیں دیکھ کر مولانا نیازی ایسے لوگوں کے

دل خون ہو گئے۔ یہ لوگ حصول پاکستان تک قید و بند کی اذیتیں اور پھانسی کے پھندے چوم کر پہنچے تھے مگر جو لوگ ان کرسیوں پر قابض ہوئے انہوں نے ان سے پلٹ کر یہ نہیں پوچھا کہ آخر آپ لوگوں نے اس قدر قربانیاں دی کیوں تھیں؟ وہ چلاتے رہے۔

غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا

ٹھیک وہاں ہمارے مذہبی طبقے کی اکثریت نے بھی جس کند ذہنی اور بے بصیرتی کا ثبوت دیا، اس سے قدرت کی طرف پاکستان کی صورت میں ملنے والی یہ نعمت اپنی افادیت کھو بیٹھی۔ یہ ایک دلخراش داستان ہے۔

گلہ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری

☆

یوں تو پاکستان کی تحریک کو کامیابی سے ہم کنار کرنے میں ایک محنت کش سے لے کر بڑے لیڈروں تک ہر طبقۂ فکر کے لاکھوں لوگوں کی جدوجہد اور قربانیوں کا حصہ ہے۔ تاہم میں قدیم وجدید کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اس وقت کے چند ایسے نوجوان قائدین کا ذکر بطور خاص کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے اپنے اعلیٰ کردار، اسلامی نظریۂ حیات پر کامل یقین، ذاتی زندگیوں میں پُر جوش اور مخلص ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو تحریکِ پاکستان کے لئے وقف کر دیا تھا۔ ان میں مولانا محمد ابراہیم علی چشتی (ایم ایم ابراہیم علی چشتی)، مولانا محمد عبدالستار خان نیازی، جناب حمید نظامی بانی ''نوائے وقت''، میاں محمد شفیع (م ش) اور حکیم محمد انور بابری سرفہرست تھے۔ مولانا محمد ابراہیم علی چشتی ایک لحاظ سے ان سب کے قائد اور رہنما تھے۔ ''پاکستان کیا ہے اور کیسے بنے گا؟'' میں روزنامہ ''نوائے وقت'' ۱۶/مئی ۱۹۴۵ء اور ۱۷/مئی ۱۹۴۵ء کے پرچوں میں جس حضرت بابا بلند کوہی زابلستانی ادام اللہ فیوضہم کے ملفوظات کے اقتباس دیئے گئے ہیں، مجھے ذاتی طور پر علم ہے اس سے مراد مولانا محمد ابراہیم علی چشتی ہیں جو نہ صرف تحریکِ پاکستان بلکہ مسلک، نظریات اور فکر کے حوالے سے ان سب کے رہنما تھے، راقم السطور کو مولانا محمد ابراہیم علی چشتی کی صحبت میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ وہ اس زمین کے نہیں کسی کُرۂ نور کے باشندے معلوم ہوتے تھے۔ تاریخ، تحقیق، علم اور مختلف زبانیں اُن کے سامنے ہاتھ باندھے ہوئے کھڑی تھیں۔ وہ تقویٰ وطہارت کا پیکر تھے۔

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

☆

پاکستان کیوں بنایا گیا؟ مناسب ہے کہ نئی نسل انگریز کے معنوی جانشینوں کی تشریح وتعبیر کو چھوڑ کر مجاہد پاکستان مولانا محمد عبدالستار خان نیازیؒ کی یہ کتاب ''پاکستان کیا ہے اور کیسے بنے گا؟'' کا مطالعہ کرے۔ اس طرح وہ ''منشورِ خلافتِ پاکستان'' پڑھے جسے مولانا نیازی نے ترتیب دیا ہے۔ اسی طرح وہ مولانا عبدالحامد بدایونی کے وہ رسائل دیکھے جو انہوں نے قیام پاکستان سے پہلے کے محرکات کی وضاحت میں تحریر کئے۔

☆

جناب محمد صادق قصوری طویل عرصے سے نئی نسل کو ماضی کا آئینہ دکھانے میں مصروف ہیں تا کہ وہ اُس کی روشنی میں مستقبل کا لائحہ عمل طے کرے۔ ماضی سے کٹ کر نہ حال کی اصلاح کی جا سکتی ہے اور نہ مستقبل کے خطوط متعین کئے جا سکتے ہیں۔ پاکستان اور بانیانِ پاکستان سے متعلق قصوری صاحب کا علمی وتحقیقی کام افراط وتفریط سے صاف اور تاریخ پاکستان کا قیمتی اثاثہ ہے۔ اُمید ہے قیام پاکستان سے پہلے تحریک پاکستان کے ایک نامور قائد کی تحریر کردہ یہ کتاب پاکستان کے قیام اور وجوہات پر پڑنے والی گرد صاف کرنے میں اہم کردار ادا کرے گی۔

نمی گردید کوتہ رشتۂ معنی رہا کردم
حکایت بود بے پایاں بخاموشی ادا کردم

☆

۱۸/اپریل ۲۰۰۸ء

سید محمد فاروق القادری ایم اے
سجادہ نشین خانقاہ قادریہ گڑھی اختیار خاں
ضلع رحیم یار خاں۔

☆/☆/☆

پیش لفظ

(ڈاکٹر سرفراز حسین مرزا ریسرچ سکالر نظریہ پاکستان فاؤنڈیشن، لاہور)

میں سمجھتا ہوں کہ ہندو ذہن کی تفہیم ہی تحریک پاکستان کے نکتے کا آغاز ہے اور ہندو ذہن کو سمجھنے اور پاکستان کو قائم کرنے کے فکری مراحل پر سیر حاصل بحث اس کتاب کا لُبِ لباب ہے۔ ''پاکستان کیا ہے اور کیسے بنے گا؟'' کے عنوان کے تحت زیر نظر تصنیف میں مجاہد ملت مولانا محمد عبدالستار خان نیازی (مرحوم) جو تحریک پاکستان کے فعال کارکن رہے اور ''پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن'' کے ابتدائی عہدیداروں میں سے ہیں، نے ''خلافتِ پاکستان سکیم'' اس وقت پیش کی جبکہ تقسیم ہند کی دیگر سکیمیں قائداعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ملک بھر کے مختلف حصوں سے متعلق مسلمان پیش کر رہے تھے۔ مولانا نیازی کی یہ سکیم بھی اسی دور کی ایک نادر دستاویز ہے۔

مولانا محمد عبدالستار خان نیازی نے دیگر ساتھیوں کے تعاون سے مختلف پمفلٹ تیار کئے جو نوجوانوں کے علاوہ مسلمان حلقوں کی کثیر تعداد میں تقسیم کئے گئے تاکہ اُنہیں ''خلافتِ پاکستان سکیم'' کے تحت مختلف پروگرام شروع کرنے کے طریق کار سے آگہی حاصل ہو جائے۔ اُن کے نزدیک اہم بات یہ تھی کہ ''خلافتِ پاکستان سکیم'' کے تحت پاکستان میں اسلامی حکومت قائم کی جائے اور اس سلسلے میں اُنہوں نے بہت دلائل پیش کئے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُنہوں نے دیگر تجاویز پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبداللطیف کی سکیم، چوہدری رحمت علی کی پاکستان وطنی تحریک، میاں کفایت علی (اے پنجابی) کی ''کنفیڈریسی آف انڈیا'' اور سر سکندر حیات کی علیحدگی کی تجویز کو متعدد وجوہات کی بنا پر رد کرتے ہوئے اُنہیں بے معنی قرار دیا۔

زیر نظر تصنیف بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ جس میں ایک حصہ تاریخ اور دوسرے میں ''خلافتِ پاکستان سکیم'' کے تحت ممکنہ شعبوں پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ۱۷۰۷ء سے ۱۹۴۷ء تک چار حصوں میں برصغیر کی تاریخ کا نچوڑ بیان کیا گیا ہے جو مطالعۂ پاکستان، تاریخ اور سیاسیات کے طلباء کے لئے خاص طور پر نفع بخش ثابت ہوگا۔ پاکستان میں ممکنہ شعبہ جات کو ۵۰ پیشوں کے حوالہ سے تجویز کیا گیا ہے اور پاکستان کے مرد حضرات اور خواتین کے لئے علیحدہ علیحدہ ذمہ داریوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس تصنیف میں مولانا نیازی نے شریعت فروش، برہمن کا ذہن، بنیے کی خصوصیات،

فرنگی کی چالیں اور پڑھے لکھے ''بابو'' حضرات کی ذہنیت پر بڑی تفصیل سے بحث کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب ایمانی تزلزل اور ضابطۂ حیات کی لغزشوں کا نتیجہ ہے اور عیہ توحید کو ترک کرنے کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس بحث میں وہ ثابت کرتے ہیں کہ ہم پاکستان میں توحید اور ایمان کی بناء پر خلافتِ اسلامیہ قائم کرنا چاہتے ہیں اور ہمارے راستے میں شریعت فروش نواب، برہمن، فرنگی اور بنیا حضرات حائل ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ ''ہماری تعبیر پاکستان اگر کچھ ہے تو وہ ایک فلسفۂ زندگی اور ضابطۂ حیات ہے۔ یہ فلسفہ اور ضابطہ اپنی تصنیف کے اعتبار سے کچھ نیا نہیں بلکہ وہی اسلام اور شریعت کے تیرہ سو سال پرانے اُصول ہیں۔ ہم نے صرف ان اصولوں کو موجودہ حالات پر عائد کر کے اس سے جو نتیجے برآمد ہوئے وہ آپ کے سامنے پیش کئے ہیں''۔ وہ کہتے ہیں کہ ''مغرب میں پارلیمانی نظام کام دے گیا جہاں ایک ہی قسم کے مویشی بستے ہیں لیکن جہاں بھانت بھانت کے جاندار سکونت رکھتے ہیں وہاں تھوڑی تعداد والوں کو جلدی احساس ہونے لگتا ہے کہ اس اصول نے ہمیں تو مار ڈالا۔ زیادہ تعداد والے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آگے اور ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پیچھے۔ بڑی ناگوار صورت حالات ہے''۔

مولانا نیازی کہتے ہیں کہ ''پاکستان کے معنی ہیں ایک ایسا تمدن، ایک ایسی سلطنت، ایک ایسی اُمت جس کی بنا پر محض توحید اور ایمان پر ہو''۔ گویا ہم ہندوستان میں اسلام کا ایک دینی، تمدنی، سیاسی اور جنگی مرکز قائم کرنا چاہتے ہیں جہاں رُوحانی، اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی، فوجی، نفسیاتی غرض ہر قسم کی قوت نفاذ کے مالک ہم اور صرف ہم ہوں گے''۔ ''ہم پاکستان میں توحید اور ایمان کی بنا پر خلافتِ اسلامیہ قائم کرنا چاہتے ہیں''۔ ''خلافتِ پاکستان کی اسلامی حکومت کا قانون دیوانی اور فوجداری معنوں میں شریعت اسلامی پر ہوگا''۔

زیر نظر تصنیف میں مجاہد ملت مولانا محمد عبدالستار خان نیازی نے پاکستان کے ہر شعبے یعنی اقتصادیات، دفاع، خارجہ پالیسی، قانون، تعلیم علیٰ ہذا القیاس ہر پہلو پر اسلامی نکتۂ نظر سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ ''تسخیر عالم'' اور ''تسخیر کائنات'' ہمارا مقصد ہے''۔ موجودہ حالات میں یہ کتاب منظر عام پر آنی چاہئے تھی۔ خداوند تعالیٰ جل شانہٗ جناب محمد صادق قصوری اور اُن کے معاونین کو اجر سے نوازے۔ (آمین)

ڈاکٹر سرفراز حسین مرزا

۲/ستمبر ۲۰۱۰ء

مقدمہ

۱۴/ جولائی ۱۹۴۵ء کو شملہ سے ویول کانفرنس کی ناکامی کا اعلان ہو گیا۔ اس ٹھوکر سے پھر ایک مرتبہ ہندوستان کے مسلمان کو احساس ہوا کہ ہمارے مستقبل کی حفاظت نہ بنیے کی مدد سے ممکن ہے اور نہ فرنگی کے سہارے۔ یہ دونوں اور کفر کی دوسری پس پردہ طاقتیں نہ جانے کب ہمارے خلاف مل بیٹھیں۔ ہمارا مستقبل صرف ہماری اپنی حق شناسی اور حق جوئی کے ساتھ وابستہ ہے۔

یہ وہ اُصول ہے جو ہم آغازِ سنِ شعور سے اپنی بساط اور ہمت کے مطابق ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے پیش کرتے آئے ہیں۔

روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ ۱۶ مئی ۱۹۴۵ء اور ۱۷ مئی ۱۹۴۵ء کے دو پرچوں میں حضرت بابا بلند کوہی زاہلستانی دام اللہ فیوضہم کے ملفوظات چھپ چکے ہیں۔ اس رسالہ کی پہلی فصل میں وہ دونوں مضامین نقل کیے جاتے ہیں۔

ہم دونوں اس بزرگ کے بلند اور پاکیزہ افکار اور اسلامی کردار سے نہایت متاثر ہوئے۔ ہم دونوں کو بجائے خود خیال پیدا ہوا کہ مسلمانانِ ہند کے موجودہ مسائل کے متعلق اس مردِ حق آگاہ کے ارشادات اگر ایک رسالہ کی شکل میں چھپ جائیں تو اس سے پاکستان کے متعلق ہمارا خواب بہت جلد پورا ہونے کی اُمید ہو سکتی ہے۔

چنانچہ اس سال ماہِ رمضان کے آخر میں ہم دونوں اکٹھے حضرت بابا صاحب کی خانقاہ میں حاضر ہوئے۔ گیارہ روز تک باہم تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔ اس گفتگو کا نچوڑ اس رسالہ میں پیش کیا جاتا ہے۔ پاکستان اور خلافت کے موضوع پر بعض قدیم رسائل میں سے کچھ اقتباسات بھی حضرت بابا صاحب کی اجازت سے اس رسالہ میں شامل کر دیئے گئے ہیں۔

رمضان المبارک کے ان نورانی گیارہ دنوں میں حضرت بابا صاحب کی برکت سے جس خضوع و خشوع اور حضور و ظہور اور سرور کی سعادتیں نصیب ہوئیں، مدت العمر ہماری زندگی کی بہترین یاد رہے گی۔ حضرت بابا صاحب سے ملاقات کے بعد ہم کو پاکستان کے قیام کا پختہ یقین ہو گیا ہے۔ یہ ہماری اور اس زمانہ کے مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے کہ ہم ایسے ولی اللہ کے دور میں پیدا ہوئے ہیں۔

ہماری دلی دُعا ہے کہ جس طرح حضرت بابا صاحب کے فیضانِ صحبت سے پاکستان کا

مسئلہ ہماری نظروں میں بالکل صاف ہو چکا ہے۔ اسی طرح عامۃ المسلمین بھی حضرت کے ملفوظات سے مستفیض ہوں۔

حضرت بابا صاحب کے ارشادات کے بعض حصے محض خواص کے سامنے پیش کیے جا سکتے تھے وہ حصے اس رسالہ میں سے حذف کر دیئے گئے ہیں۔ وقت آنے پر انہیں حضرت بابا صاحب خود پاکستان کے سچے معتقدین کے سامنے بیان کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ ہمیں اور سب اہل پاکستان کو توفیق دے کہ جلد بابا صاحب کو سرزمین پاکستان میں مدعو کیا جا سکے۔

الراقمان

محمد عبدالستار خان نیازی ایم اے
رکن کونسل آل انڈیا مسلم لیگ

محمد شفیع ایم اے
چیف رپورٹر اخبار "سول اینڈ ملٹری گزٹ"
لاہور

☆/☆☆/☆

حضرت بابا بلند کوہی زابلستانی دام اللہ فیوضہم

(حضرت بابا بلند کوہی زابلستانی کی پُر اسرار اور حقانی شخصیت نے تھوڑے ہی عرصے کے اندر ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی حلقوں میں جو اہمیت حاصل کر لی ہے وہ محتاج تعارف نہیں۔ حضرت کے افکار اور تعلیمات کا ملخص یہ ہے کہ آج کے مسلمان کی زبوں حالی اور پستی کا بنیادی سبب ہمارا غیر اسلامی کردار اور ایمانی تزلزل ہے۔ پاکستان بنے گا تو اس شامتِ اعمال سے تائب ہونے کے بعد ہی بنے گا۔ آپ موجودہ ہندوستانی مسلمانوں کی حالت سے سخت بیزار ہیں اور تب تک ہندوستان آنے پر آمادہ نہیں جب تک یہاں کے عقائد و اعمال میں کچھ بہتری نہ ہو جائے۔ اس وقت حضرت اپنی قیام گاہ کا پتہ بھی کسی کو نہیں بتانا چاہتے۔ ہندوستان میں حضرت کا تعارف پہلی مرتبہ روزنامہ نوائے وقت لاہور کے ذریعہ ہوا تھا۔ ذیل میں ہم ۱۶/مئی اور ۱۷/مئی ۱۹۴۵ء کے "نوائے وقت" کے دو پرچوں میں سے وہ مضامین نقل کرتے ہیں۔ یہ مضامین میاں محمد شفیع صاحب ایم۔ اے چیف رپورٹر "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کے قلم سے تھے۔ جیسا ان مضامین سے پتہ چلے گا خود شفیع صاحب کی حضرت بابا صاحب سے ملاقات بھی اتفاقیہ تھی۔ آج ہم اسے مسلمانانِ ہند کی قسمت کے لئے حُسنِ اتفاق سمجھتے ہیں)۔

(۱)

گذشتہ اپریل مجھے اپنے دفتری فرائض کے سلسلہ میں صوبہ سرحد کے مشہور و اہم مقامات دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ سرحد کی وزارت میں تازہ بتازہ تبدیلی ہوئی تھی۔ زبانوں پر اکثر اسی کے چرچے تھے۔ جتنے منہ اتنی ہی باتیں۔ میں مسلم قوم کا ایک فرد ہونے کی حیثیت میں طبعاً اس انتشار سے مشوش تھا۔

ایک روز صبح میں انہیں خیالات میں غلطان و پیچان، قصہ خوانی کے بازار سے لوٹ رہا تھا کہ راستہ بھول گیا۔ میں اپنی قیام گاہ تک پہنچنے کے تردد میں تھا کہ ایک تنگ بازار میں ایک نانبائی کی دوکان پر غیر معمولی جمگھٹ دیکھ کر رُک گیا۔ وہاں کچھ جھگڑا ہو رہا تھا۔ میری اخباری

نامہ نگاری کی رگ پھڑکی اور میں ٹھٹک گیا۔ نانبائی معمر تھا۔ جھگڑا کرنے والا ایک جوان تھا اور اپنی طاقت کے گھمنڈ میں تیزی دکھا رہا تھا۔ وہ غصہ کے عالم میں کچھ سخت سُست کہہ گیا۔ بڑے میاں بھی کہنے کو تو بڑھے تھے لیکن تاؤ میں آ گئے۔ بات بڑھتے دیکھ کر نہ جانے کیوں میں ہجوم میں گھس گیا اور بیچ بچاؤ کروا دیا۔ میرے خاکی لباس اور ہیٹ نے اثر دکھایا۔ جھگڑا ختم ہوتے دیکھ کر ہجوم بھی منتشر ہو گیا۔ میں نے آگے بڑھنے کے لئے قدم اُٹھاتے ہوئے نانبائی کو ملامت آمیز لہجہ میں کہا، تم پشاور کے مسلمان ذرا ذرا سی باتوں پر آپس میں جھگڑتے رہتے ہو۔ مسلم قوم کا مستقبل اور اتحاد خطرہ میں ہے، تمہیں اس کا کچھ خیال نہیں؟ نانبائی ایکا ایکی چشم پُر نم ہو گیا اور کہنے لگا۔ خانصاحب! میں تو خاموش تھا اُس نوجوان نے ہی گالی دے کر مجھے مشتعل کر دیا۔ نانبائی کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈباتے دیکھ کر مجھے اس سے کچھ ہمدردی ہو گئی اور میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ تم لوگ محلہ محلہ ایسی انجمنیں کیوں نہیں بناتے جو عوام کو اسلامی اخلاق و عادات کی تلقین کریں؟ بڑھے نے ایک آہ سرد کھینچتے ہوئے کہا، خانصاحب! آپ بھی تو "حضرت بابا صاحب" جیسی باتیں کرتے ہیں۔ آج کل لوگوں کو اس طرف کہاں دھیان ہے۔ وہ تو سینما دیکھنے، ریڈیو سننے اور چرٹوں کا دھواں سونگھنے میں منہمک رہتے ہیں۔

میں نے تجسس کیا تو معلوم ہوا یہ "بابا صاحب" ایک ولی اللہ ہیں جو مضافات میں حضرت بابا بلند کوہی زابلستانی کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ نانبائی بھی ان کا معتقد دکھائی دیتا تھا۔

میں سرحد کے معززین اور پولیٹیکل لیڈروں سے ملاقاتیں کرتے کرتے کچھ اُکتا گیا تھا۔ نانبائی نے اُن ولی اللہ کا ذکر کچھ ایسے اعتقاد سے کیا کہ لمحہ بھر کے لئے اُس کی آنکھوں کی **چھچھلتی** ہوئی پُر اسرار کیفیت نے مجھ پر وجد طاری کر دیا۔ بے اختیار میرا دل چاہا کہ چلو پشاور آئے ہیں تو ان "بابا صاحب" کی بھی زیارت کرتے چلیں۔ نام تو ضرور دلچسپ ہے۔

میری توقع کے خلاف نانبائی نے میرے شوقِ زیارت کا استقبال کچھ بہت تپاک سے نہ کیا۔ پہلے تو اُس نے مجھے سرے سے ہی ٹالنا چاہا۔ پھر خاصی جرح کے بعد جب اسے یقین ہو گیا کہ میرا پولیس یا سی۔ آئی۔ ڈی سے کوئی تعلق نہیں اور میں محض ایک غیر سرکاری اخبار کا نمائندہ ہوں تو وہ اُس پہاڑ کی کھوہ تک میری راہنمائی کرنے پر آمادہ ہو گیا جہاں حضرت بابا صاحب آجکل مقیم ہیں۔

دوسرے روز علی الصبح بڑھا نانبائی وقتِ مقررہ سے بہت پہلے اس کوٹھی پر پہنچ گیا جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ اپنے ساتھ چار گرم گرم نان بھی لایا تھا۔ پشاور کی شیریں گندم کے پھولے

پھولے لذیذ خمیری نان نے میرے باورچی کی بنائی ہوئی ملائی والی کشمیری چائے کے ساتھ مکھن توس سے بھی زیادہ لطف دیا۔

ناشتہ کے بعد ہم اس کار میں سوار ہوئے جو میرے میزبانوں کی مہربانی سے میرے تمام قیام پشاور کے دوران میں میرے لئے وقف رہی۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا کا لطف اُٹھانے کے لئے خود ڈرائیور کی نشست پر بیٹھا۔ نانبائی اس قیمتی اور پُر تکلف موٹر کے اندر نرم گدّوں پر بیٹھ کر بہت خوش ہوا۔ شاید اسے اپنی عمر میں پہلی مرتبہ اس کا اتفاق ہوا تھا۔

جمرود کی طرف چند میل سفر کرنے کے بعد کار کو سڑک کے کنارے پر کھڑا کر دیا گیا اور نانبائی مجھے پہاڑوں کے درمیان پتھریلی پگڈنڈیوں سے گزرتا ہوا مشرق کی طرف لے چلا۔ ہمیں قریباً ایک گھنٹہ پیدل چلنا پڑا۔ میں خاصہ تھک گیا۔

خشک پہاڑیوں کے گرد دشوار گزار پگڈنڈیوں میں چکر کاٹتے کاٹتے میں اُکتا چلا تھا کہ نانبائی ایک مہیب چٹان کے سامنے رُک گیا۔ چٹان کچھ ایسی اونچی تو نہ تھی لیکن ایسی کالی سُنسان اور ڈراؤنی تھی کہ دن کے وقت بھی دہشت محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے ایک لمحہ کے لئے خیال گزرا کہ کہیں اس دہشت ناک مقام میں رہنے والا بھی کوئی "مُلّائے حزیں" نہ ہو۔ اُس کے سر کے بالوں کی لٹیں پریشان اور گرد آلود ہوں گی۔ گلے میں سُرخ تسبیح ہوگی۔ ماتھے پر سجدہ کا سیاہ نشان۔ وہ اپنی خوفناک بیخواب آنکھوں سے میری جانب گھورے گا۔

میں دل ہی دل میں ولی اللہ کی شکل کا تصوّر کر رہا تھا کہ ہم چٹان کے پہلو میں غار کے منہ تک پہنچ گئے۔ نانبائی نے بھدّے دیہاتی وضع کے چوبی دروازہ پر دستک دی۔ ایک اُجلے کپڑوں والے خوش وضع ملازم نے دروازہ کھولا اور ہماری توقعات کے خلاف بڑی تمیز سے اندر لے گیا۔

چٹان کے اندر مکانیت مختصر تھی۔ ایک چھوٹی سی تاریک ڈیوڑھی سے گزر کر ایک بڑا کمرہ تھا۔ کمرہ میں چاندنی بچھی تھی۔ ایک طرف سلیقے سے بہت بڑا گاؤ تکیہ لگا ہوا تھا۔ تکیہ کے سہارے ایک ادھیڑ عمر لیکن مضبوط ڈیل ڈول کا بارعب شخص مصلّے پر بیٹھا استغراق سے قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا۔ مجھے کمرے میں آراستگی دیکھ کر تعجب ہوا۔ فرش فروش اور آرائش امیرانہ تھی۔ بابا صاحب کے دائیں طرف ایک برہنہ شمشیر آبدار رکھی تھی۔ بائیں جانب جدید ترین جرمن ساخت کا ایک پستول پڑا تھا جس کی بابت بعد میں مجھے پتہ چلا کہ بیک وقت مسلسل دس فائر کر سکتا ہے۔ بابا صاحب کی پشت کی طرف دیوار پر دو بڑے بڑے نقشے لٹک رہے تھے۔ ایک دُنیا کا نقشہ تھا

جس میں مشہور تجارتی گزرگاہیں، ریلوے، آبادی اور پیداوار دکھائی گئی تھی۔ دوسرا اجرام فلکی کی گردش کا مرقع تھا۔

کمرہ میں چٹان کے دوسرے رُخ پر تین کھڑکیاں تھیں جو سب کی سب کھلی تھیں۔ ان میں سے بائیں باغیچہ کی معطر ہوا اور دوپہر کے سورج کی تیز روشنی داخل ہو کر کمرہ کو ایک مخصوص کیفیت دے رہی تھی۔

بابا صاحب کی شخصیت میں کچھ ایسی ہیبت اور جلال تھا کہ میں کمرہ میں داخل ہوتے ہی مرعوب ہو گیا۔ رسمی تعارف کے بعد جب بابا صاحب کو معلوم ہوا کہ میں ایک مشہور اخبار کا نمائندہ ہوں اور ہندوستان کی اسلامی سیاست کے متعلق اُن کے ارشادات سے مستفید ہونا چاہتا ہوں تو وہ ایک انداز استغنا سے زیر لب مُسکرائے۔ پھر اپنے مخصوص افغانی لہجہ میں کہنے لگے۔ تم سپاٹ میدانی علاقہ میں رہنے والے لوگ باتیں بہت بناتے ہو، کام کچھ نہیں کرتے۔ کہو آجکل کیا ہنگامہ برپا کر رکھا ہے۔ کس سیاسی کھلونے سے دل بہلا رہے ہو۔ پہلے انگریز آئے تو سر سیّد کی قیادت میں تمہیں تعلیم کا شوق ہوا۔ وہ بخار کچھ ٹھنڈا پڑا تو ملازمتوں اور ووٹوں کے تحفظ کی فکر ہوئی۔ پھر "خلافت" کے چکر میں پڑے رہے۔ کچھ دنوں "عدم تعاون" اور "ہجرت" کا شغل بھی کیا۔ بعد ازاں چندے تبلیغ کی دھن سمائی۔ پچھلے دنوں تنظیم کے بڑے چرچے تھے۔ آج کل کہو کیا انہماک ہے؟

مجھے بابا صاحب کے یہ پُر از معلومات سوالات سُن کر تعجب تو ضرور ہوا۔ لیکن میں نے سنبھلتے ہوئے جواب دیا کہ بابا صاحب! آپ ملّت کے مستقبل کی نسبت یہ قنوطیت ترک کر دیجئے۔ ہندوستان کے مسلمان نے دو سو سال بھٹکنے کے بعد اپنی منزل جانچ لی ہے، اُس نے اپنے جداگانہ وجود کا احساس کر لیا ہے، اب کسی کا مکر و فریب اُسے خود فراموشی میں مبتلا نہیں کر سکتا۔ ہم بجائے خود ایک مستقل ملّت ہیں۔ ہم ایک تقدیر کے مالک ہیں۔ مسلم لیگ ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ ہمارے معتمد لیڈر ہیں۔ آپ مایوسی کو تھوک دیجئے۔ ہندوستان کا مسلمان اپنی قسمت کی باگ ڈور خود اپنے ہاتھ میں سنبھال چکا ہے۔ ہمیں صرف اپنی قوتِ بازو پر اعتماد ہے۔ ہم کسی کے محتاج نہیں۔ ہم پاکستان بنائیں گے اور خود ہی بنائیں گے۔

بابا صاحب ایک مشفقانہ اور بزرگانہ انداز میں سر کو جُنبش دیتے ہوئے بولے، یہ سب بہت خوشی کی باتیں ہیں۔ مبارکباد کی مستحق ہیں۔ خود اعتمادی بڑی اچھی چیز ہے۔ لیکن برخوردار!

خود اعتمادی حقائق کو فراموش کرنے کا نام نہیں۔ ہم اکیلے وہی کام کر سکتے ہیں جس کا تعلق محض ہماری ذات سے ہو۔ جس مہم میں کچھ دوسرے لوگوں کا بھی واسطہ ہو اس میں ہم اُن کے وجود کو بھول کر کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں۔

فرض کر لو اُن کا رویہ نامعقول ہے۔ چند منٹ کے لئے یہ بھی مان لو کہ وہ انصاف نہیں کر رہے۔ ممکن ہے وہ حقائق بھی نظر انداز کر رہے ہوں۔ شاید اس میں اُن کا بھی نقصان ہے۔ لیکن جس مکان میں ایک سے زیادہ مکین رہتے ہوں وہاں تم دوسروں کو راضی کئے بغیر کیوں کر من مانی کارروائی کر سکتے ہو؟ ہندوستان میں حکومت وقت ہے۔ حکومت وقت کے ملکی گماشتے اور معتقدین ہیں۔ والیان ریاست ہیں۔ برادران وطن ہیں۔ خود تمہاری قوم کے ایسے افراد اور جتھے ہیں جو تمہاری تنظیم میں شامل نہیں یا اپنے مفاد کو تم سے متضاد خیال کرتے ہیں۔ یہ غیر متعلق ہے کہ وہ کن وجوہات کی بناء پر ایسا کرتے ہیں۔ یہ حقیقت تو مسلمہ ہے کہ وہ ایسا کرتے ہیں۔ پھر اگر تم ان سب سے آنکھیں میچ کر اپنی سی ہی کیے جاؤ تو اس سے کیا خیر برآمد ہونے کی توقع ہو سکتی ہے؟

بابا صاحب نے یہ ساری باتیں کچھ اس طرح ٹھہر ٹھہر کر دل نشیں پیرایہ سے کہیں کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ لیکن میں بھی آسانی سے مایوس ہونے والا نہ تھا میں پھر آواز اونچی کرتے ہوئے بولا کہ بابا صاحب! دُنیا میں کون سی قوم ہے جسے وہی حالات درپیش نہیں جو آپ نے ابھی گنوائے ہیں۔ تاریخ میں کون سا گروہ اُبھرا جسے ان دقتوں کا سامنا نہ ہوا۔ آخر وہ ان رکاوٹوں پر اپنے عزم، اپنی ہی کوششوں اور اپنے ہی تشخص سے غالب آئے۔ غیروں نے تو کبھی اُن کے لئے راستہ صاف نہ کیا۔ آپ یوں ہی مایوسی کی باتیں کرتے ہیں۔ زندہ رہنا ہے تو اپنی کوشش سے پاکستان بنا کر۔

بابا صاحب نے فرمایا میری مراد مایوس کرنا نہیں۔ اصل اُمید وہی ہے جو نا اُمیدی کے اسباب کا پورا جائزہ لے کر آگے بڑھے۔ تم نے تاریخ میں چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے غالب آنے کی جو مثال دی ہے اس پر غور کرو گے تو دیکھو گے کہ وہ صرف تین ہی راستوں سے منزل مقصود تک پہنچیں۔ یا تو انہوں نے اپنے مخالفین کو اپنا لیا، یا اُنہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ یا اُنہیں اپنے راستہ سے ہٹا دیا۔ تم نے بھی ان میں سے کسی ایک صورت کا جتن کر لیا ہے؟

تم خود اعتمادی کا ذکر بار بار کرتے ہو۔ اس کی بھی کچھ شرطیں ہیں۔ اگر تم دوسروں سے علیحدہ اور ممتاز رہنا چاہتے ہو تو اس کے لئے تمہیں پہلے دوسروں سے مختلف بننا پڑے گا۔ یکسانیت سے اتحاد لازم آتا ہے۔ ایک راستہ پر چلنے والے لوگ چاہے مختلف جگہوں سے کیوں نہ آئے ہوں

اور چاہے علیحدہ علیحدہ نیتوں سے کیوں نہ سفر کر رہے ہوں دیر یا زُود ضرور اکٹھے ہو جایا کرتے ہیں۔ چلنا جو ایک ہی ڈگر پر ہوا۔

تمہاری خصوصیت کی جتنی بھی صفتیں ہیں، جنہیں اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملی ہیں۔ پرانے امتیازات چھوڑ کر پچھلے سو سال میں تم نے جو کچھ بھی حاصل کیا ہے اس میں تمہارے ہمسایوں اور تمہارے درمیان سر مو فرق نہیں۔ دونوں ایک ہی طرح کے بال کٹاتے ہو۔ ایک سے اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پاتے ہو۔ ایک سے ہوٹلوں میں کھانا کھاتے ہو۔ ایک سے سینما اور ریڈیو سنتے ہو۔ ایک سے انگریزی اخبارات اور کتابیں پڑھتے ہو۔ ایک سے انجمنیں بناتے ہو۔ ان میں ایک ہی طرح ووٹ شمار کر کے فیصلے کرتے ہو۔ تمہاری ملازمتیں اور تجارتیں، تمہاری کوٹھیاں اور ان کے فرنیچر، تمہارے فیشن ایبل لباس، حتیٰ کہ تمہارے ہیرو اور نیک و بد کے تصورات روز بروز زیادہ سے زیادہ ایک ہی مغربی سانچے میں ڈھلتے جا رہے ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ ایک ہی تھیٹر گھر میں ناچنے والوں میں بھی باپ دادا کی نسبت سے سید اور ڈوم کا فرق چلا آتا ہے۔ ایک شاہ صاحب ہیں تو دوسرے میر صاحب۔ لیکن گھل مل کر رقص کرتے رہنے سے یہ کسر بھی چند روز میں گھس پٹ کر پوری ہو رہے گی۔ ایک ہی اوکھلی میں پِستا ہے تو الگ الگ چھلنیوں میں کب تک چھنتے رہو گے؟

اکیلے دادا کی انجب سے پاکستان ممکن ہوتا تو تمہارے ابّا کیوں غلام بنتے۔ اب تو اس میں کچھ اور کم ہو چکا ہے۔ تم ہر چہ "پدر نتوانست پسر تمام کند" کے چکر میں پڑے ہو۔ جب تک اُپنے گاڑھے پسینے کی کمائی سے کچھ اضافہ نہ کرو گے، کچھ ڈوبے ہوئے قرضے برآمد نہ کراؤ گے۔ خالی دادا میاں کے نام پر تو دوکان چلنے سے رہی۔ باپ جو ساکھ بگاڑ گئے تمہاری، اور مرے بھی دیوالیہ ہو کر۔ تم برخوردار الگ ہوش سنبھالنے سے آج تک الٹے تلّے اڑا رہے ہو۔ اور اُمنگ ہے کہ دادا میاں کی جائیداد سنبھالیں گے۔ خیر سے! چشم بددور!! کیوں نہ ہو!!!

بابا صاحب کے طنز میں ناقابل برداشت تلخی آ چکی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں اپنے تصور کے کسی "ولی اللہ" سے نہیں بلکہ کسی ماڈرن "تجربہ کار اور دُور اندیش مدبر" سے گفتگو کر رہا ہوں۔ شاید حقیقی ولی اللہ اتنے نرم اور سادہ نہیں ہوتے جتنا میں اُنہیں خیال کئے بیٹھا تھا۔

میں نے اپنا پہلو کمزور دیکھ کر گفتگو کا رُخ بدلا۔ میں بولا، بابا صاحب! یہ باتوں کی گھنگھنیوں سے تو پیٹ نہ بھرے گا۔ موجودہ حالات میں جو بُرا بھلا ممکن ہے ہم کر رہے ہیں۔ آپ یہاں چٹان کی کھوہ میں گھس کر کچھ بھی تو نہیں کر رہے۔ زمانہ دُعائے خانقاہی کا نہیں،

میدان رزم میں شاہبازی کا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم صحیح راستہ پر نہیں تو آپ ہی ذرا ڈگر پر آجایئے نا۔ ورنہ فقیر کو دینے کے لئے کچھ پلے نہیں تو کم از کم اس کا دل تو کھوٹا نہ کیجئے۔

بابا صاحب بشاشت سے ہنسے اور فرمانے لگے۔ باتوں باتوں میں دیر ہو گئی۔ اب تم لنگر سے کچھ کھانا کھالو میں بھی اپنے معمولات سرانجام دیتا ہوں۔ باقی باتیں شام کی نشست میں ہوں گی۔ ہم خالی باتیں کرتے ہی نہیں، باتیں بتاتے بھی ہیں۔ برخوردار! خالی دُعا کردن، شیوۂ بیوہ زنان است۔ مردانِ خدا کاری کنند، کاری کنند۔

کھانا آیا تو مرغ کا پلاؤ تھا۔ بڑہ کے کباب تھے۔ بھنی ہوئی مچھلی تھی۔ قسم قسم کے میوے تھے۔ میں نے پیٹ بھر کر کھایا۔

میں حیران تھا کہ میں کسی ولی اللہ کا مہمان ہوں یا کسی خاندانی رئیس کا۔ کم از کم آجکل عام طور پر تو ولی اللہ کے متعلق کچھ ایسا ہی تصور ہے کہ نہ اُسے ڈھنگ سے کھانا آتا ہو اور نہ آرام سے رہتا اور یہاں حضرت بابا بلند کوہی زہلستانی کے دسترخوان پر مجھے وہ نعمتیں میسر آرہی تھیں جو سرحد کے بڑے بڑے خوانین کے ہاں بھی نہ ہوں گی۔ کیا خستہ کباب تھے۔ کیا خوشبودار چٹنیاں!

حضرت بابا صاحب سے شام کی ملاقات آئندہ قسط میں بیان ہو گی۔

(۲)

نمازِ عصر کے بعد ہم پائیں باغ میں پھر اکٹھے بیٹھے۔ ایک سنگین چبوترہ پر قیمتی قالین بچھا تھا۔ بابا صاحب اپنے مخصوص انداز میں بائیں کہنی گاؤ تکیہ پر رکھ کر نیم دراز ہو گئے۔ دایاں ہاتھ وہ اثنائے گفتگو میں کبھی کبھی زور زور سے ہلاتے تھے۔ باغ میں پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ چبوترہ کے پہلوؤں میں جعفریوں پر گاڑھی سبز بیلیں لپٹی تھیں۔ بابا صاحب اس وقت سر برہنہ تھے۔ مجھے ان کا چوڑا سینہ، پُرنور چہرہ، کشادہ پیشانی اور بڑا سر دیکھ کر احساس ہوا کہ عمر ڈھل جانے کے باوجود ان میں مردانہ رعنائی کا ایک انداز ہے۔

یہاں یہ ذکر کر دینا بے موقع نہ ہوگا کہ دوپہر کو میں نے اپنے ساتھیوں اور موٹر کو رخصت کر دیا تھا۔ قرار پایا تھا کہ وہ لوگ پھر آکر مجھے یہاں سے لے جائیں گے۔

میں نے بابا صاحب کو مخاطب کر کے اپنا وہی سوال دوہرایا جس پر صبح کی گفتگو ختم ہوئی تھی۔ "اگر آپ سمجھتے ہیں کہ مسلم لیگ یا ہندوستان کے مسلمانوں کی دوسری جماعتیں اس طرح کام نہیں کر رہیں جیسے کرنا چاہئے تو آپ پبلک طور پر اپنا زاویہ نگاہ کیوں پیش نہیں کرتے۔ آپ ان جماعتوں کے نقائص دور کرنے کی خاطر ان میں کام کیوں نہیں کرتے۔ یہاں غار میں چھپ

کر اعتراض کرنے پر اکتفا کیوں کرتے ہیں"۔

بابا صاحب نے فرمایا برخوردار! تم نے میرا مطلب غلط سمجھا۔ میں نے مسلم لیگ یا دوسری جماعتوں کو ہرگز بُرا نہیں کہا۔ نہ ان میں نقص بتایا ہے۔ جماعتوں میں کبھی نقص نہیں ہوا کرتا۔ جماعتیں تو محض کام کرنے کا ڈھنگ ہیں۔ ہر ڈھنگ پر کام کرنے کا کوئی موقع ہوتا ہے اور اس موقع پر اسی ڈھنگ سے کام نکل سکتا ہے۔ کام کرنے والا ہو تو وہ اپنے ڈھنگ کا موقع ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔ یا ضرورت ہو تو پیدا بھی کر لیتا ہے۔ نقائص ہمیشہ انسانوں اور شخصیتوں میں ہوا کرتے ہیں۔ یہ جماعت پرستی تو دراصل مغرب کی لعنت ہے جو ہم اہل مشرق میں بھی سرایت کر رہی ہے۔ مشرق ہمیشہ سے شخصیت اور چلن کا معتقد رہا ہے۔ جماعت فی نفسہٖ کوئی شے نہیں۔ مسلم لیگ کا تو کیا ذکر میں تو کانگرس اور ہندوستان میں برطانیہ کے نظامِ حکومت کو بھی بطور جماعت کے بُرا نہیں کہتا۔ بُرے بھلے کا اطلاق صرف شخصیت پر ہوتا ہے۔ جماعت تو مفید یا غیر مفید ہو سکتی ہے۔ جماعتوں کو بُرا بھلا کہنا کہاں کی معقولیت ہے اور سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ جماعت چلانے والے بھلے ہوں تو وہ کسی بھی جماعت کو بھلا بنا لیا کرتے ہیں۔

ہر چہ گیرد علتی علت شود کفر گیرد کاملے ملت شود

تم کہو گے روگ جماعت کا نہ سہی شخصیت کا سہی۔ لیکن میں اس روگ کی برائی یہاں بیٹھ کر کیوں کرتا ہوں، چوراہے پر بیٹھ کر علاج کیوں نہیں کرتا، تو سنو! ہر خاندان یا ملت پر دو وقت آتے ہیں۔ ایک جب اس کی رُوح کی نمائندہ شخصیتیں مل کر کام کرتی ہیں۔ دوسرے جب خاندان بکھر جاتا ہے یا ملت منتشر جاتی ہے۔ اُس وقت صرف انفرادی فرائض ادا ہو سکتے ہیں۔ جب تک ایک شخصیت کے بہت سے لوگ نہ ہوں، مل کر کیسے کام ہو سکتا ہے۔ میں یہاں خاموش نہیں بیٹھا۔ میرے دست و بازو سندھ، بلوچستان، پنجاب، بنگال، چین، روس، ایران، عراق، شام، عرب، مصر، طرابلس اور نائیجیریا ہر جگہ موجود ہیں۔ لیکن وہ غریب اور بیکس لوگ ہیں۔ خدا کی مظلوم اور ستم رسیدہ مخلوق۔ اکثر و بیشتر امیروں پر اللہ تعالیٰ نے اُن کے گناہوں کے سبب لعنت نازل کر رکھی ہے۔ وہ خبیث محض ہیں۔ ان کی شخصیتیں مسخ ہو چکی ہیں، وہ بدنیت ہیں، بدکار ہیں، پھر بدحال کیوں نہ ہوں۔ اُن کے باپ دادا نے لوگوں کا خون چوس چوس کر اور ہڈیاں پیس پیس کر جو اندوختے جمع کر رکھے ہیں، ان کا وبال ان کی گردنوں کا ہار بن چکا ہے۔

میں نے کہا بابا صاحب! بات تو یہاں سے چلی تھی کہ آپ کی رائے میں ہم ہندوستانی مسلمان صحیح راستہ پر نہیں چل رہے۔ میں نے پوچھا تھا پھر وہ کونسا بہترین راستہ ہے جس پر چل کر

ہم مسلمانوں کے لئے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ آپ نے بات دوسری باتوں میں اُلجھا دی اور میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔

بابا صاحب نے فرمایا گھبراؤ نہیں۔ یہ مسلّم ہے کہ ہماری موجودہ زندگی ویسی نہیں جیسی ہونی چاہیے۔ زندگی انداز فکر کا دوسرا نام ہے۔ اگر تم اپنے موجودہ انداز فکر پر ہی اڑے رہے تو میری کیا خاک سمجھو گے۔ تم جس طرح مسائل پر سوچنے کی عادی ہو میں اسے قبول نہیں کرتا۔ "ہندوستان کے مسلمانوں کی بہتری اور نجات کا راستہ کیا ہے"۔ فکر کی یہ نہج اپنے اندر ہی اپنی خرابی کا خمیر رکھتی ہے۔ اس میں بجائے خود ایک تضاد ہے۔ جب تمہارے خیالات میں خود ہی منطقی رابطہ نہ ہو تو سوائے تمہاری متضاد کوششیں آپس میں ٹکرا کر رائیگاں جانے کے اور کیا نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے؟

دیکھو! مسلمان کسی نسل کا نام نہیں۔ مسلمانوں کی کوئی خاص رنگت نہیں۔ کوئی خاص شکل نہیں۔ جرمنوں اور انگریزوں کی طرح ہماری رگوں میں ایک خون کا جوش مشترک نہیں۔ مسلمان تو انسانوں کے ایک ٹولے کا نام ہے جن کی صفتِ مشترک محض اسلام ہے۔ اب جب تم مسلمانوں کی نجات، حفاظت اور بہتری کا نام لیتے ہو تو اس سے دلچسپ مغالطے پیدا ہوتے ہیں۔ اِن لفظوں کے ایک معنے تو یہ ہو سکتے ہیں کہ ان گوشت پوست کے لوتھڑوں کی خوراک، لباس اور جسم کے آرام کی حفاظت اور ترقی جو مسلمان کہلاتے ہیں، قطع نظر اس سے کہ یہ سہولتیں کیونکر، کس سے یا کس مقصد اعلیٰ کے لئے حاصل کی جائیں۔ دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ ان کو دوسرے گوشت پوست کے لوتھڑوں سے ممتاز کرنے والی صفت یعنی اسلام کی ترقی وغیرہ وغیرہ۔

اب ان میں سے ہر ایک مفہوم کے عملی تقاضے بالکل جدا جدا ہیں۔ اپنے جسم، لباس اور خوراک کی ترقی کے لئے ہمیں ہندو، انگریز اور دُنیا کے ہر دوسرے غیر اسلامی ٹولے سے حالات کی مناسبت مدِنظر رکھتے ہوئے مدد مل سکتی ہے لیکن خود اسلام کی ترقی کے لئے غیر اسلامی ٹولوں کو نرمی سختی سے بدلنے کے علاوہ اور راستہ ہی کیا ہے۔ اس میں ان سے مدد نہیں مل سکتی۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ مؤخرالذکر اسلامی ترقی بھی اس دُنیا میں انسانوں کے جسم، لباس اور ماحول میں تبدیلیوں کی شکل ہی میں اپنے آپ کو ظاہر کرے گی لیکن فرق یہ ہے کہ یہاں ہمیں کسی غیر مسلم سے مدد نہیں مل سکتی۔

پچھلے دو سو سال میں مسلمانوں کی تمام بدبختیوں اور رُوسیاہیوں کی داستان کا نچوڑ یہ ہے کہ وہ اپنے معتقدات کا اطلاق روزمرہ کے حالات پر کر کے کوئی واضح داخلی اور خارجی پروگرام یا پالیسی اختیار نہ کر سکے۔ انہوں نے اس طرف توجہ نہ دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی داخلی اور خارجی

دونوں زندگیاں اعتقادی، ایمانی اور ارادی لحاظ سے دوغلی بن گئیں۔ اُوپر ضروریات اور مجبوریوں کی ایک تہہ تھی جو مغرب کو بہہ رہی تھی اور نیچے یقین اور تمناؤں کی ایک تہہ تھی جو مشرق کو مچل رہی تھی۔ یہ اس کو گدلا کرتی تھی تو وہ اس کا دم گھونٹتی تھی۔ نہ یہ پنپ سکی نہ وہ پروان چڑھی۔ یہ ایک گناہ کبیرہ تھا جس میں شرک خفی اور شرک جلی دونوں کی شامت شامل تھی۔ آج اس کی پاداش ہم تم اور سب بھگت رہے ہیں۔

داخلی پروگرام اور پالیسی سے مراد یہ ہے کہ واضح اسلامی اصولوں سے روزمرہ کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق عادات اور رسوم کے استخراج کا سلسلہ جاری رہتا۔ خارجی پروگرام اور پالیسی سے مراد یہ ہے کہ اپنی اور اپنے ہمسائیوں اور آس پاس والوں کی تمناؤں، اُلجھنوں اور ضرورتوں کا گہرا اندازہ لگا کر تو ازن کیا جاتا کہ کس سے کہاں اور کیا مدد مل سکتی ہے اور کس سے کہاں تصادم ناگزیر ہوگا۔ یہ دونوں روزانہ بدلتے رہنے والی چیزیں تھیں۔ چاہے اصول قائم رہے لیکن متحرک کائنات میں عمل ساکن رہنے کی گنجائش کہاں۔

برعکس اس کے انگریزوں کی آمد سے لے کر آج تک ہندوستان کے مسلمانوں کا داخلی روّیہ تو یہ رہا کہ سلف کی وراثت سے بیزار اور باہم جوتی بیزار۔ خارجی حکمت عملی یہ رہی کہ ہندوؤں نے جھنجھوڑا تو انگریز کی وفاداری کا دم بھرنے لگے۔ انگریز نے دُھتکارا تو ہندو کے گلے سے لٹک گئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس آمد و رفت میں سو (۱۰۰) پیاز بھی کھانا پڑا اور سو (۱۰۰) جوتے بھی۔ نشانۂ ستم بھی بنے اور قربانی کا بکرا بھی، اقتدار نذر سرکار ہوا اور جمع جتھا گاؤ خورد۔ اگر ہماری حرکات اس قدر سبک اور مضحکہ خیز ہونے پر یقین نہیں آتا تو یہ بتاؤ ہماری حالت کیوں اتنی سبک اور مضحکہ خیز بن گئی۔

داخل اور خارج کو یوں خلط ملط کر دینے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ اس دورُخی سے نہ ہماری فرنگی سے بنی اور نہ ہندو سے چلی۔ بنتی بھی تو کیوں اور چلتی بھی تو کیسے۔ ہم تو فرنگی سے احیائے خلافت اور ہندو سے قیام اسلام کی توقعات لگائے بیٹھے تھے۔ یہ نہ سمجھے کہ دُنیا والوں سے دین کی اُمیدیں نہیں نبھ سکتیں۔ غرض آخرت کے ساتھی ڈھونڈتے ہم یہاں بھی کوئی دوست نہ بنا سکے۔

آج بظاہر پاکستان کا عقیدہ اختیار کر کے ہم نے اپنی غلطی کی اصلاح کر لی ہے اور خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو چکے ہیں۔ آئینی مقدمہ بازی میں مانتا ہوں، ہمارا اس دفعہ کا عرضی دعویٰ بہتر ہے لیکن تجزیہ کرو تو ہماری مستقبل کی تمام اُمیدیں آج بھی وہی ممکنات کے سہارے کھڑی ہیں۔ اوّل یہ کہ ہندو ہمارے مبنی برحق و انصاف مطالبہ کو تسلیم کر لے۔ دوسرے یہ کہ انگریز جب

حالات سے مجبور ہو کر آئین میں کوئی تبدیلی کرے تو ہمارے حقوق بھی مدِنظر رکھے۔ ہندو نہ مانا تو اُسے بھی تو کچھ نہ ملے گا اور انگریز بھلا ہمیں ختم کیسے کر سکتا ہے۔ وہ ننھے میاں والی بات ہوئی کہ کل جو لڈو آئیں گے تو چچی اس میں ہمارا حصہ بھی ضرور بالضرور رکھ لینا اور جو تم نہ مانیں تو چچا میاں تو ہمیں ضرور ہی ہمارا حصہ دیں گے اور جو دونوں نہ مانے تو ہم اُدھم مچائیں گے کہ گھر سر پر اُٹھا لیں گے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر چچا میاں کل لڈو ہی نہ لائے، یا لائے اور ایک ننھے میاں کے منہ میں ٹھونس کر ان کا حلق بند کر دیا اور باقی چچی چچا یا اکیلے چچا ہی ہضم کر گئے تو پھر ننھے میاں کس کے تھانے رپٹ لکھوائیں گے۔

زندگی مفرد نہیں۔ مرکب ہے۔ ملت پر ہزار محاذ سے یورش ہو رہی ہے پھر ہم ایک ہی قطار میں سیدھے کھڑے ہو کر سب کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں؟ ابھی تک ہم نے ان تمام خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک ہی قسم کی لیڈر شپ پیدا کی ہے:۔ لاؤڈ سپیکر کے سامنے کھڑے ہو کر تقریریں کرنے والا لیڈر، میں اس نمونہ کی مذمت نہیں کرتا۔ ان کی بھی ایک محاذ پر ضرورت ہے۔ لیکن سب وکیل ہی تو نہیں کوئی مدعی بھی تو چاہئے۔ ضرورت ہے گاؤں گاؤں اور محلہ محلہ تعمیری کام اور روزمرہ کی انجمنوں میں راہنمائی کرنے والوں کی، ضرورت ہے سب سے بڑھ کر اُن کی جن کی شخصیت دیکھ کر ہر ایک کا دل چاہے کہ اُن کا بن جائے۔

تم کہو گے یہ تعلیم کی کمی کا نقصان ہے۔ میں متفق نہیں۔ اس کام میں لکھت پڑھت اور نکتہ نوازی کی اتنی ضرورت نہیں جتنی غور کر کے کسی نتیجہ پر پہنچنے۔ اس نتیجہ کو حاصل کرنے کی مہارت رکھنے، اپنی مہارت کو ایمان اور استقلال کے ساتھ استعمال کرنے اور منزل کی طرف کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈھ کر پہنچنے کے جنون کی ضرورت ہے۔ یہ صفتیں بیشتر تعلیم یافتوں میں نہیں ہوتیں اور کئی بغیر پڑھے لکھے ان سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ کیا تم نے کبھی نہیں دیکھا کہ اکثر دفاتر کے کسی پوچی بابو کی نسبت ایک تندرست اور چالاک چپڑاسی زیادہ کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ وہ بات کو سمجھتا ہے اور کام کر سکتا ہے۔ یہ جذبات کی تربیت اور ارادہ کی راستی ہے۔ اس کا تعلق خالی دماغ سے نہیں۔

بابا صاحب کی تقریر سنتے اب جھٹپٹا ہونے لگا تھا۔ ان کی آنکھوں میں ایک مستانہ چمک اور دلآویز روشنی تھی، جسے ان کے سرخ ڈورے اور بھی پُر تمکنت بنا رہے تھے۔ وہ نمازِ مغرب کے لئے رخصت ہوئے اور میں بھی موٹر پر واپس آ گیا۔ ان کی گفتگو کا خلوص اور فکر کی گہرائی میرے قلب پر انمٹ نقوش چھوڑ گئی۔

......☆/......☆/......☆/......☆/......

﴿پاکستان ہے کیا؟﴾

پاکستان ہے کیا؟

گذشتہ پانچ چھ سال میں پاکستان کے لفظ نے غیر معمولی شہرت حاصل کی ہے۔ ہندو اخبارات اس لفظ کو مسلمانوں کے ناجائز غلبہ کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ مسلمان پاکستان کا مفہوم یہ سمجھتے ہیں کہ جن صوبوں یا شمالی ہندوستان کے جن علاقوں میں اُن کی اکثریت ہے وہاں مُسلم راج قائم کیا جائے۔ پھر مسلمانوں میں بھی جو مذہب کے زیادہ دھنی ہیں اُن کا خیال ہے کہ پاکستان میں قرآنی قوانین نافذ کئے جائیں گے۔ پاکستان "مُسلم راج" نہیں بلکہ "اسلامی راج" ہوگا۔ اقتدار کسی گروہ کے ہاتھ نہیں بلکہ چند اصولوں پر مبنی ہوگا، جو ان اصولوں کو اپنائے گا، اقتدار کا مالک ہوگا۔

پاکستان کی ابتداء کے متعلق بھی مختلف نظریے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ سید جمال الدین افغانی نے اسے پہلی مرتبہ پیش کیا۔ کچھ لوگ اسے ڈاکٹر سر محمد اقبال کے اُس خطبہ سے منسوب کرتے ہیں جو انہوں نے ۱۹۳۰ء میں بمقام الٰہ آباد، مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے دیا تھا اور جس میں انہوں نے تجویز کیا تھا کہ انگریزی اقتدار کے ماتحت شمالی ہندوستان کے مُسلم اکثریت کے علاقے جداگانہ انتظامی صوبوں کی شکل میں تبدیل کر دیئے جائیں۔ غالباً انہیں یہ خیال تقسیم بنگال سے پیدا ہوا تھا۔ یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ آل انڈیا مسلم لیگ نے ۱۹۴۰ء میں اجلاس لاہور کے موقعہ پر ایک قرارداد منظور کی تھی جس میں یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ شمال مشرقی اور شمال مغربی ہندوستان کے مسلم اکثریت کے علاقے خود مختار ریاستی وحدتوں کی شکل میں باقی ہندوستان سے جدا کر دیئے جائیں۔ بعد میں مسلم لیگ نے اس قرارداد کی جو تصریحات کی ہیں اُن سے واضح ہوتا ہے کہ اس علیحدگی سے مراد ایک قطعاً جدا اور مختار مطلق سلطنت کا قیام ہے۔

دراصل پاکستان کا قرار واقعی مفہوم معین کرنے کے لئے ہمیں تین باتیں طے کرنی ہیں۔ اوّل تو یہ کہ اس لفظ کی بنیاد کیسے پڑی۔ دوسرے یہ کہ پچھلے پانچ چھ سال میں وہ کیا محرکات تھے جن سے اس لفظ میں یک لخت جادو کا سا اثر پیدا ہو گیا اور ہندوستان کی سیاسی فضا میں چاروں طرف پاکستان، پاکستان کی گونج سنائی دینے لگی۔ تیسرے یہ کہ پاکستان کی تحریک کی تہہ میں کیا قوتیں کام کر رہی ہیں، اُن کی نوعیت کیا ہے اور آگے جا کر اُن سے کیا شکل اختیار کرنے کی توقع

ہو سکتی ہے۔

لفظِ پاکستان:۔

ہوشیار پور کے ایک بے فکرے اور منچلے نوجوان ۱۹۲۸ء میں انگلستان میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اُن دنوں ہندوستان ''سائمن کمیشن'' اور ''نہرو رپورٹ'' کے متعلق جھگڑے فساد میں غرق تھا۔ اس نوجوان کا نام تھا چوہدری رحمت علی۔ اُنہوں نے دیکھا تو مغرب کی سیاست، قومیت کے تصور سے لبریز نظر آئی۔ خیال پیدا ہوا کہ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کا مستقبل فرنگی کے سایہ تلے مضبوط کرنا ہے تو وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے مفاد کو ''وطن'' اور ''قوم'' کی رنگت دی جائے، ورنہ ہندو بازی لے جائے گا۔ انگریز وطنی اور قومی مطالبات سمجھ سکتا ہے، دین کے نام سے اُسے چڑ ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے کشمیر، پنجاب، صوبہ سرحد، آزاد قبائلی علاقہ، بلوچستان اور سندھ کے سبز نقشہ کا بلاک تیار کیا۔ پنجاب سے ''پے'' لی، آزاد قبائلی علاقہ کو صوبہ افغانیہ کا نام دے کر وہاں سے ''الف'' لیا، کشمیر سے ''کاف'' لیا، سندھ سے ''سین'' لیا اور بلوچستان سے ''تان'' شامل کر کے اس ''پے۔ الف، کاف، سین اور تان'' کے مجموعہ کا نام رکھا، ''پاکستان''۔ اُن کے نزدیک یہ ایک مستقل ملک تھا۔ اس وطن کے باشندے بلا تمیز ہندو، مسلمان اور سکھ ایک قوم تھے اور دو ہزار سال سے یہ وطن اور اس میں بسنے والی قوم کی جداگانہ تاریخ کے مالک تھے۔

یہ تھی لفظ پاکستان کی ابتداء۔ اب چوہدری رحمت علی اور اُن کے نظریۂ پاکستان کو تو کوئی جانتا نہیں البتہ لفظ ''پاکستان'' زبان زدِ عام ہے۔ دراصل اب عُرفِ عام میں پاکستان کو ''پاک'' اور ''مقدس'' کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔

تحریکِ پاکستان:۔

ایک تحریک کے طور پر پاکستان کا چرچا ۱۹۴۰ء سے شروع ہوا ہے جبکہ مسلم لیگ نے ''قراردادِ پاکستان'' منظور کی۔ اس کی ابتداء یوں ہوئی کہ ۱۹۳۷ء میں جب کانگرسی وزارتیں برسرِ اقتدار آئیں تو اُنہوں نے اپنی طاقت کے زعم میں کئی جگہ کسی مسلمان کو وزارت میں شامل ہی نہ کیا، شامل کیا تو صرف اپنے ڈھب کے مسلمانوں کو۔ یہ عام پالیسی دانستہ اور نادانستہ مسلمانوں کے خلاف ہوگئی۔ مدرسوں میں بندے ماترم کے گیت پڑھے جانے لگے، کانگرس کا ترنگا جھنڈا موقع بے موقع تمام سرکاری اور عوامی عمارتوں اور اداروں پر لہرایا جانے لگا۔ عام تعلیم کے لئے

''ودیا مندر'' کی اسکیم رائج کی گئی۔ یہ تمام اقدامات مُسلمانوں کے لئے دلخراش تھے۔

اُس وقت مسلم لیگ، مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تھی جو کانگرس کی مخالفت کر رہی تھی۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں جب لکھنؤ میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا تو عوام میں جذبات کی یہ کیفیت تھی کہ کئی مرتبہ مقررین اور سامعین دونوں پر رقت طاری ہوگئی۔ یہیں پنجاب سے سر سکندر حیات، بنگال سے فضل الحق، آسام سے سر سعد اللہ، لیگ میں آ شامل ہوئے۔ مولانا حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خاں انقلاب کے علمبردار تھے۔ چوہدری خلیق الزماں بامحاورہ چٹکیاں کاٹتے تھے۔ سرحد کے سردار اورنگزیب سبکو مذاق اڑاتے تھے، محمد علی جناح کا آئینی دماغ وہ نکتے نکالتا تھا کہ گاندھی بھی گنگ تھا۔

دو سال بعد ۱۹۳۹ء میں جنگِ یورپ شروع ہوئی تو کانگرس نے انگریز سے عدمِ تعاون کا راستہ اختیار کیا۔ یوں حکومت واقعات اور مصلحتِ وقت دونوں کے پیشِ نظر مسلم لیگ کو کانگرس کے کلّے ٹھلے کی جماعت تسلیم کرنے پر مجبور ہوگئی۔

۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ نے علیحدگی کی قرارداد منظور کی تو سب سے پہلے ہندو اخبارات نے اسے ''پاکستان'' کا نام دیا۔ وہ اس کی مخالفت کچھ ایسے تعصب سے کرتے تھے کہ خواہ مخواہ مسلمانوں میں جوابی عصبیت کے طور پر اس تحریک سے وابستگی پیدا ہوتی جاتی تھی۔

اسی دوران میں مولانا ظفر علی خان اور مولانا شوکت علی جیسے بزرگوں نے کانگرس کے ساتھ اپنی سال ہا سال کی رفاقت کے بعد اس کی وہ پُرزور مخالفت شروع کی جس نے مسلمان عوام کو یکسر کانگرس اور گاندھی سے بدظن کر دیا۔ جب یہ لوگ ہندوؤں کے ساتھ مل کر اپنی قربانیوں اور ہندوؤں کی بدسلوکی کی روایات و حکایات سُناتے تھے تو ہر چھوٹے بڑے مسلمان پر اثر ہوتا تھا۔

بنائے پاکستان:۔

دراصل پاکستان کی بنا پیغمبرِ اسلام حضور سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس روز رکھ دی تھی جب اسلام کا انقلابی نظریہ انسان کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ تاریخِ بنی آدم میں اسود اور احمر سب کو پہلی مرتبہ یا ایھا الناس کہہ کر خطاب کیا گیا۔ زبان، رنگ، نسل، نسب، دولت اور علم کے تمام امتیازات نظر انداز کر کے صرف تقویٰ کو تمدنی اعزاز کا معیار مقرر کیا گیا۔ اسی روز مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان ایک خلیج حائل ہوگئی۔ چین، ترکستان، ایران، عراق، ترکی اور دوسرے ممالک کے مسلمان مُرورِ ایام سے وہ سبق بھول گئے لیکن ہندوستان میں

دس کروڑ مسلمانوں کو ایسے تیس (۳۰) کروڑ ہمسایوں سے واسطہ پڑا جو نہ روٹی میں کسی کو شریک کرتے ہیں نہ کبھی بیٹی دیتے ہیں اور تو اور گھر میں سر چھپانے کو جگہ دیں تو چوکا بھرشٹ ہو جائے گا۔ ایسے رُوکھے سوکھے، تنگ اور سنگدل ہتوں میں بیٹھ کر خدا یاد نہ آئے تو کیا سر پھوڑ کر مر جائیں۔ ہم تو شاید اپنی علیحدگی بھول ہی جاتے لیکن وہ چھنگیاں کاٹ کر، ٹھوکریں لگا کر، پانی کا پیالہ دینے سے انکار کر کے اور اپنے بدصورت سے بدصورت اور ذلیل سے ذلیل ساتھی کے مقابلہ میں ہم پر اپنے گھر کے پٹ بند کر کے ہمیں ہر گھڑی احساس دلاتے ہیں کہ:

توحید کے ماننے والو! "تم مشرکوں سے جدا ہو"۔

مسجد والے سو بھی جائیں تو مندر والے گھنٹے بجا بجا کر بیدار کر دیتے ہیں۔ گیارہ کروڑ شودروں کی شومئی قسمت ہر گھڑی للکار للکار کر تنبیہ کرتی ہے۔

مسلمان کا یہ علیحدگی کا احساس اُن کا جداگانہ طرزِ فکر اور مخصوص طریقۂ زندگی، پاکستان کی "اصل بنیاد" ہے۔

پاکستان کا رائج العام مفہوم:۔

آج کل اگر دیکھا جائے تو ہندوستان میں پاکستان کی تحریک کی تہہ میں مسلمانوں کی اسلامیت کام کر رہی ہے۔ وہ ایک اسلامی سوسائٹی اور اسلامی سلطنت چاہتے ہیں جہاں وہ اسلام کے مطابق زندگی کے تمام شعبے چلا سکیں۔ بظاہر اس آرزوئے دل نے یہ شکل اختیار کی ہے کہ مسلم لیگ نے تقسیم ہندوستان اور مسلمانوں کی واحد نمائندگی کا دعویٰ دائر کر رکھا ہے۔ حکومت وقت کانگرس کی چیرہ دستیوں سے تنگ آ کر مسلم لیگ کے ان دعاوی کو یہاں تک تسلیم کر چکی ہے کہ ملک کا آئندہ آئین کانگرس اور مسلم لیگ کی رضامندی سے بنے گا، ورنہ جو کچھ ہے ویسا ہی رہے گا۔ یہاں تک پہنچ کر گاڑی رُک چکی ہے۔ انگریز اپنی طاقت سے تقسیم کرنے پر آمادہ نہیں اور کانگرس نہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کا واحد نمائندہ تسلیم کرتی ہے نہ ہندوستان کی تقسیم پر رضامند ہے۔

پاکستان کی اہمیت:۔

پاکستان کی موجودہ تحریک صرف اپنی اندرونی اُٹھان سے نہیں اُٹھی بلکہ اسے کانگرس کی ظالمانہ اور جابرانہ روش نے اُبھارا ہے۔ مسلمانوں کے درمیانی طبقہ کی اقتصادی بدحالی اور نوکری پیشہ لوگوں کی ملازمتی پیشہ ورانہ اور تاجرانہ رقابت کو بھی اس میں دخل ہے۔ حکومتِ وقت نے اپنی سامراجی مصلحتوں کے پیش نظر اس تحریک کو تسلیم کر لیا ہے لیکن پاکستان کی اصلی اہمیت ان پوشیدہ

اور خوابیدہ قوتوں اور ممکنات میں مضمر ہے جو احیائے اسلام کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ یہ طاقتیں اور ممکنات ابھی بیداری کے نہایت ابتدائی مراحل سے گزر رہے ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ یہی تحریک کی اصل جان اور مغز ہیں۔ باقی سب حادثات کا لباس ہے۔

یہ درست ہے کہ فوری اور ہنگامی لحاظ سے دیکھنے والوں کی نظر میں یہ حادثات کا لباس زیادہ اہم ہے لیکن آخر بین اور دُور اندیش لوگوں کے نزدیک حقیقی قوت اور اصل بہ زیادہ قابلِ توجہ ہے۔

اس کتاب میں آئندہ ہم جہاں "پاکستان" کا لفظ استعمال کریں گے وہاں اس سے یہی اسلامی مقصدِ اعلیٰ اور دینی نصب العین کا مفہوم لیں گے۔

پاکستان سے ہمارا مطلب:۔

بالعموم جب پاکستان کے متعلق گفتگو ہوتی ہے تو موافق اور مخالف دونوں اس کی ابتداء ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں سے کرتے ہیں۔ دیکھئے صاحب! دس کروڑ انسان اپنی پسند کا نظام حکومت بنانا چاہتے ہیں یا جناب دس کروڑ انسان کسی نظامِ حکومت میں رہیں، اُن کے امتیازات کون مٹا سکتا ہے۔ برعکس اس کے ہماری نہج فکر اور استدلال اس کے بالکل اُلٹ ہے۔ ہم پہلے یہ سوچتے ہیں کہ پاکستان میں سوسائٹی کا نظام کیسا ہوگا؟ وہاں نظامِ حکومت کیا ہوگا؟ پاکستان میں بسنے والے لوگ کیسے ہوں گے؟ پھر یہ تصور ہمارے من کو بھاتا ہے۔ تب ہم پاکستان بنانے کے خواہشمند ہو جاتے ہیں۔ درحقیقت دیکھا جائے تو دس کروڑ مسلمان بھی اسی تصور کی آرزو میں مسلمان بنے پھرتے ہیں۔ ورنہ مسلمان کوئی نسل نہیں۔ کسی ملک کا باشندہ ہونے سے انسان مسلمان نہیں بن جاتا۔ یہ درست ہے کہ اب صدیوں سے مسلمانوں کے گھر پیدا ہونے والے مسلمان اس چاہت سے نہیں بلکہ اپنے حقِ پیدائش سے مسلمان بن جاتے ہیں۔ لیکن بات یہی ہے کہ مسلمان ہونا ایک ایمانی کیفیت ہے۔ کوئی محض جسمانی خصوصیت نہیں۔ یہ ایمانی چاہت خواہ کتنی ہی ڈھیلی پڑ چکی ہو، مسلمان اسی سے ہی مسلمان ہیں، جس روز (خدانخواستہ) یہ نہ رہی ہم خالی ایرانی، ترک اور ہندوستانی رہ جائیں گے، مسلمان نہ ہوں گے۔

اگر خالی معاش کے مسائل کا حل پیش نظر ہو تو پاکستان کے علاوہ دوسرے مؤثر طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔

کیا مصلحت وقت پاکستان کی متقاضی ہے اور اس سے کسی عملی نتیجہ کی توقع کی جا سکتی ہے؟

منطقی باریکیوں میں گئے بغیر اتنی بات واضح ہے کہ مسلمانانِ ہند اگر موجودہ صورت حالات کو ائل سمجھتے ہیں اور اُن کا یہ بھی خیال ہے کہ اسلامی مقصدِ حیات کا حصول اُن کے لئے ناممکن ہے یا یہ کہ اسلامی ضابطۂ حیات اُن کی موجودہ ضروریات کو پورا نہیں کر سکتا اور اس کی تلاش میں سرگرم ہونے سے انہیں خطرات پیش آنے کا خدشہ ہے تو پھر یا تو انہیں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنا چاہئے اور پھر اسلامی مقصدِ حیات ترک کر کے وہ ضابطۂ حیات اختیار کر لینا چاہئے جو انہیں زیادہ موزوں نظر آتا ہے۔

بہر حال جو لوگ اسلامی مقصدِ حیات کو ترجیح دیتے ہیں اُن کے لئے صرف ایک ہی راستہ کھلا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس نصب العین کے حصول میں اپنے تمام ممکنات اور اپنی تمام طاقتیں خرچ کر دیں۔ اگر کسی مقصد کو کامیابی سے حاصل نہ بھی کیا جا سکتا ہو تو اس کے لئے شجاعت سے لڑتے ہوئے دُنیاوی زندگی ختم کر دینا ہمیشہ ممکن ہوتا ہے۔ ذلت کی زندگی سے عزت کی موت ہمیشہ قابلِ ترجیح ہے۔ دُنیا کی بہتری ناممکن بھی ہو تو عاقبت کی بہتری ہر وقت مسلمان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ پھر یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ جو مرنا چاہتے ہیں وہی جینے کا سامان کیا کرتے ہیں۔

جو دیکھی ہسٹری کا مل تو یقیں آیا
جسے مرنا نہیں آیا اُسے جینا نہیں آیا

کہا جا سکتا ہے کہ اسلام تو بے شک اس قابل ہے کہ انسان اس کی خاطر لڑتے لڑتے مر جائے لیکن موجودہ مسلمان کہاں اس قابل ہیں کہ ان کو لڑانے سے کوئی مفید نتیجہ مرتب ہونے کی اُمید ہو سکے۔ اندریں حالات کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ان کمزور ٹٹوؤں کی طاقت کے مطابق کوئی ہلکا سا بوجھ انتخاب کر لیا جائے۔ مثلاً فرنگی کے سائے میں جداگانہ حقوق کا عاجزانہ مطالبہ یا کانگرس کے پیچھے لنگڑاتے ہوئے چل کر انجامِ خیر کی اُمید۔

جواب اس کا یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کی کمزوری لاعلاج ہے تو چاہے ہلکا بوجھ اختیار کیا جائے چاہے بھاری، اُن کی ذلت لازمی ہے۔ بوجھ کبھی طاقت کے مطابق نہیں بنائے جا سکتے۔ ہمیشہ طاقت ہی بوجھ کے مطابق تیار کرنی پڑتی ہے۔ اگر طاقت بڑھانے کی بجائے بوجھ گھٹانے کا راستہ اختیار کیا جائے تو یہ وہ عادت ہے جو کہیں ختم ہی نہیں ہوتی۔ اس کا منطقی نتیجہ آخر بتدریج ذلت کی موت ہے۔

بقدرِ ہر سکوں راحت گزید بنگر مراتب
دویدن، رفتن، ایستادن، نشستن، خفتن ومُردن!

ہماری تعبیر کے سوا پاکستان کی باقی تمام تعبیریں ناقص ہونے کی وجہ:۔

اس وقت تک پاکستان کی جو مختلف تعبیریں کی گئی ہیں، اُن میں یا تو کانگرس کے ساتھ زمین کی خیالی تقسیم پر اکتفا کی گئی ہے یا دستورِ حکومت میں مسلمان ''اقلیتوں'' کے ''حقوق'' اور ''مفاد'' کے لئے ''تحفظات'' اور ''مراعات'' حاصل کرنے کی خاطر آئینی دفعات کی ایزادی یا ترمیم کو منتہائے نظر سمجھا گیا ہے۔

یہ غلطی اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج بد مسلمانوں کی سیاسی ناکامی اور ذلت کا اصلی سبب نہیں بلکہ اس غلطی اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج دونوں کا اصل باعث گذشتہ پون صدی کے مسلمان لیڈروں کی مدافعانہ ذہنیت رہی ہے۔ ان لیڈروں میں سے اکثر یا تو مغربی طرز کے ''تعلیم یافتہ'' تھے یا ''ابلہانِ مسجد''۔ جن چند حضرات کو مشرقی اور مغربی دونوں علوم پر عبور تھا، انہیں یہ توفیق نہ ہوئی کہ دونوں کو ہضم کر کے کچھ تازہ قوت حاصل کرتے۔ نتیجہ یہ کہ یا تو وہ اندھا دُھند عہدِ حاضر کی روشنی سے چندھیا کر اسلام کے ''**تسخیر عالم**'' کے پروگرام سے نا امید ہو جاتے رہے یا بسم اللہ کے گنبد میں بند قعرِ گمنامی وناکامی میں پڑے رہے اور یا خواجہ شرف ہر دو طرف بنے رہے۔

یہ قاعدہ ہے کہ جب انسان اپنے غلبہ اور اقتدار سے مایوس ہو جائے یا اُس کو اپنے اوپر پورا اعتماد نہ رہے تو پھر یا تو اُس کی پروازِ ہمت اپنی حفاظت کی فکر تک ہی محدود رہتی ہے اور یا وہ ''**ہم نشینانِ قفس**'' کی صحبت کو ائل تصور کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ کچھ لوگوں کو تو آزادی کا واحد راستہ کانگرس کی ٹانگ تلے نکلنے میں نظر آیا اور کچھ حضرات ''اسلام کو خطرات سے بچانے اور مسلمان اقلیتوں کی حفاظت'' کی فکر میں لگ گئے۔

پاکستان کی دوسری تعبیروں کے نقائص:۔

ڈاکٹر عبد اللطیف کی تعبیرِ پاکستان میں مندرجہ ذیل چار بڑے نقائص ہیں:۔

(۱) وہ نقل مکانی اس وسیع پیمانے پر کرانا چاہتے ہیں کہ جو ہندوستان جیسے ملک میں ناممکن ہے۔

(۲) وہ مسلمانوں کے لئے کسی ایسے مرکز کا انتظام نہیں کرتے جہاں ہم صحیح معنوں میں علیحدہ رہ سکیں یا جہاں سے ہمارے ''**تسخیر عالم**'' کے پروگرام کی ابتداء کی اُمید ہو سکے۔

(۳) وہ مغربی جمہوریت کے لعنتی پارلیمنٹری طرزِ حکومت کو قبول کرتے ہوئے ہندوستان کی مرکزی فیڈریشن یا کانفیڈریشن کا طوق ہمیشہ کے لئے مسلمانانِ ہند کے گلے میں ڈالنا چاہتے ہیں۔

(۴) اُنہوں نے حصولِ مقصد کے لئے کوئی عملی طریقہ کار تجویز نہیں کیا۔

چوہدری رحمت علی اور اُن کے چند اینگلو محمڈن نوجوانوں نے انگلستان میں بیٹھ کر پاکستان کی جو وطنی تعبیر تیار کر رکھی تھی اس میں ذیل کے چار بڑے نقائص ہیں:۔

(۱) وہ مسلمانوں کو جغرافیائی قومیت کے غیر اسلامی مرض میں گرفتار کر کے ہمیشہ کیلئے ایک مجہول سی چار دیواری میں بند کر دینا چاہتے ہیں۔

(۲) اُن کی حدودِ پاکستان سے ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت باہر رہ جاتی ہے۔

(۳) اُنہوں نے بھی مغربی جمہوریت کا لعنتی پارلیمنٹری نظام قبول کر لیا ہے۔

(۴) حصولِ مقصد کے لئے کوئی طریقہ کار پیش نہیں کیا۔

ایک پنجابی (میاں کفایت علی) نے مُسلم انڈیا کے نام سے پاکستان کی جو تعبیر پیش کی تھی، اُس میں تین بڑی کمزوریاں ہیں:۔

(۱) بجائے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے کوئی مرکز قائم کرنے کے اُن کی وہی لامرکزیت برقرار رکھتے ہوئے اُلٹے بنگال اور پنجاب کو حریف بنا کر اُن میں پھوٹ پیدا کرنے کا سامان مہیا کر دیا ہے۔

(۲) جو طریقہ کار تجویز کیا ہے وہ خارجی اور مصالحانہ ہے نہ کہ داخلی اور انقلابی۔

(۳) اُنہوں نے بھی مغربی جمہوریت کے لعنتی پارلیمنٹری طرزِ حکومت کو قبول کر لیا ہے۔

سر سکندر حیات خاں کی تعبیر پاکستان میں مندرجہ ذیل چھ موٹے موٹے سقم ہیں:۔

(۱) اُنہوں نے نیشنلزم کے غیر اسلامی اُصول کو تسلیم کر کے مسلمانوں کے جداگانہ وجود کی بنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں۔

(۲) اُنہوں نے بھی بجائے مسلمانوں کے لئے کوئی مرکز قائم کرنے کے اُن کی طاقتوں کو منتشر کر کے کمزور کر دیا ہے۔

(۳) حصولِ مقصد کے لئے کوئی طریقہ کار تجویز نہیں کیا گیا۔

(۴) مغربی جمہوریت کا لعنتی پارلیمنٹری نظام قبول کر لیا گیا ہے۔

(۵) مسلمانوں کے تسخیرِ عالم کے پروگرام کو قطعاً نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

(۶) مسلمانوں کی اسلام سے بیگانگی دُور کرنے پر توجہ ہی نہیں دی گئی۔

ہماری تعبیرِ پاکستان ایک ضابطۂ حیات ہے:۔

قوموں کی زندگی اور وقار آئین، دستور اور معاہدوں سے نہیں ہوا کرتا بلکہ ایمانی، اخلاقی، اقتصادی اور حربی طاقت سے ہوا کرتا ہے۔ اگر ایک نااہل قوم کو کسی قوم کے ذریعہ حکمران بنا بھی دیا جائے تو وہ دو دن میں محکوم بن جائے گی اور اگر کسی اہل قوم کو داؤ پیچ سے مطیع بھی کر لیا جائے تو وہ چند روز میں اپنے فاتحوں کو مسخر کر کے چھوڑے گی۔

جو بڑھے گا، مرتبہ اُس کا بڑھایا جائے گا　　جو گرے گا اپنے درجہ سے، گرایا جائے گا

حق ہے غالب کو کہ کچلے اور دے مغلوب کو　　ہے سزا کمزور ہونے کی یہی انجام کار

پس ثابت ہوا کہ قوموں کی زندگی اور موت، اُن کی ذلت اور وقار، اُن کے ایمان سے وابستہ ہے نہ کہ اُس آئین اور دستورِ حکومت سے جس کے ماتحت وہ زندگی بسر کر رہی ہوں۔ وجہ یہ کہ طاقتِ ایمانی، آئین اور دستور کو بدل سکتی ہے لیکن آئین اور دستورِ حکومت، ایمان ٹھیک نہیں کر سکتے۔ مسلمانوں کا تنزل تبھی سے شروع ہوا جب سے اُن کا ایمان کمزور ہو گیا۔ جب تک ایسے لوگ موقع پر موجود ہیں جن کا اعتقاد ہم سے زیادہ پختہ ہے، ہمیں اُن کے سامنے ناکام ہی رہنا پڑے گا، چاہے مقابلتاً ہمارا اعتقاد ٹھیک ہی کیوں نہ ہو۔ لہٰذا برعکس پاکستان کی دوسری تمام تعبیروں کے ہماری تعبیرِ پاکستان کا اوّلین مقصد زمین کی تقسیم اور آئینی تحفظات نہیں بلکہ ہماری تعبیرِ پاکستان کا اوّلین مقصد وہ "طاقتِ ایمانی" ہے جو زمین کی تقسیم، تحفظات اور مراعات بلکہ اُن سے بھی بڑھ چڑھ کر چیزیں حاصل کر سکتی ہے۔

اگر ہم زمین کی تقسیم اور اپنے آئین کا ذکر ابھی سے کر رہے ہیں تو صرف اس لئے کہ قوتِ ایمانی اپنے مقاصد کے شعور سے جلد بیدار ہوتی ہے۔ جب لوگوں کی منزل سے دلبستگی پیدا کر دی جائے تو انہیں راستے کی مصیبتیں اُٹھانے پر زیادہ آسانی سے آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ الغرض ہماری تعبیرِ پاکستان اگر کچھ ہے تو وہ ایک **فلسفۂ زندگی اور ضابطۂ حیات** ہے۔ یہ فلسفہ اور ضابطہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے کچھ نیا نہیں بلکہ وہ اسلام اور شریعت کے تیرہ سو سال پُرانے اصول ہیں، ہم نے صرف ان اصولوں کو موجودہ حالات پر عائد کر کے اُس سے جو نتیجے برآمد ہوں، وہ آپ کی خدمت میں پیش کرنے ہیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ انسانی زندگی ایک توحید ہے، انسانی شخصیت ایک وحدت ہے۔ اس لئے ہماری مختلف ضروریات جُدا جُدا اور متضاد طریقِ عمل سے پوری نہیں کی جا سکتیں۔ ہماری تعبیرِ پاکستان پر جو کوئی عمل کرنا چاہے اُسے وہ حیثیتِ مجموعی قبول کرنی ہوگی۔ ہمیں اُدھورے مقلدین منظور نہیں۔

☆/☆/☆/☆

۱۷۰۷ء سے لے کر ۱۹۰۷ء تک

اسلام اور پاکستان:۔

ہم نے ابھی دیکھا کہ پاکستان محض زمین کے کسی ٹکڑے یا کسی خاص انسانی گروہ کے اقتدار کا نام نہیں بلکہ پاکستان ایک ضابطۂ حیات ہے۔ یہ ضابطۂ حیات، اسلام ہے۔ جداگانہ وجود کا تصور اسلام کی گھٹی میں پڑا ہے۔ چنانچہ "دارالسلام" اور "دارالحرب" اُس کے دور کے یادگار الفاظ ہیں جب نہ ہندوستان میں مسلمانوں کی کوئی مظلوم اقلیت تھی اور نہ ہی مسلمانوں کو دوسری قوموں سے کسی قسم کا خطرہ محسوس ہوا کرتا تھا۔ مسلمان ہونے کے معنی یہی ہیں کہ پہلے دُنیا کے ایک ٹکڑے میں نیکی اور سلامتی کا راج قائم کر کے باقی بدی اور بدامنی والے ٹکڑے سے جنگ لڑی جائے رُوحانی، اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی اور ضرورت ہو تو جسمانی جنگ بھی۔ یہ "جہاد" تب تک جاری رہے گا جب تک دُنیا سے بدی اور بدامنی ختم نہیں ہو جاتے یا آخری مسلمان اپنے خون کا آخری خطرہ نہیں بہا چکتا۔

اسلام صرف چند مذہبی اُصول ہی پیش نہیں کرتا بلکہ الٰہیات، اخلاق، معاشرت، حکومت، تعزیر، عدل اور لین دین کے لئے بھی ایک مخصوص نظام تجویز کرتا ہے۔

ہندوستان میں اسلام:۔

جب تک مسلمانوں کو سلطنت حاصل تھی، دین، معاشرت، سیاست، عدالت، اور اقتصادیات سب کچھ اُن کے اپنے ہاتھ میں تھا، اس لئے عوام کو کبھی اس حقیقت کا چرچا کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی کہ اسلام کا انتظامی، عدالتی اور اقتصادی نظام جداگانہ ہے۔ وہاں علماء اپنی کلاسوں میں ضرور ان مسائل کی چھان بین کرتے تھے۔

اب جبکہ سلطنت فرنگی کے پاس ہے اور تجارت بنئے کے ہاتھ تو ہندوستان میں اسلامی زوال کی ہر نئی اور انوکھی تعبیریں کرنے والے بوجھ بجھکڑ ہر روز ایک اچنبھا نظریہ پیش کرتے ہیں کوئی کہتا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر نے ہندوؤں سے بگاڑ کر غلطی کی، اکبر کی طرح بنا کر رکھتا تو آج ہم اس حالت کو نہ پہنچتے۔ کوئی کہتا کہ مغلوں نے ہندوؤں کی دلجوئی میں اسلام فراموش کر دیا اسی گناہ کی سزا بھگت رہے ہیں۔ طاقت ہاتھ میں تھی سب کو مسلمان بنایا ہوتا، یا پھر نامسلمانوں کو ختم کر دیا ہوتا تو آج اقلیت اور اکثریت کے جھگڑے سے چھوٹے ہوتے۔ کوئی

کہتا ہے کہ اسلامی آبادی کی اکثریت والے علاقے مسلمانوں کا وطن قرار دیئے جانے چاہئیں تھے اور باقی مقبوضہ علاقہ۔ کسی کو شکایت ہے کہ شہنشاہیت کے بجائے جمہوری طرز حکومت بنانا تھا۔ کسی کے نزدیک سارے روگ کی جڑ یہ ہے کہ صنعت و حرفت اور تجارت کمزور ہو گئی۔ کسی کا دعویٰ ہے کہ نئی مشینیں ایجاد کرنی تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جب پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسلام کی بنیاد رکھی تو یہ ایک ایمانی انقلاب کا پیغام تھا جو قبول کرنے والے کی جان کو بدل کر چند ہی روز میں اُس کا جسم اور ماحول سب کچھ کیمیا جیسے اثر سے بدل ڈالتا تھا۔ یہ پیغام کسی انسان کا مَن گھڑت نہ تھا بلکہ اللہ جل شانہٗ نے خاص وحی کے ذریعہ خود اپنے عظیم و برتر پیغمبر محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا تھا۔ اس پیغام کی بنیاد تھی "توحید"۔ دُنیا اور عقبیٰ دونوں کی توحید۔ کائنات کی پُر اسرار طاقتوں کی تہہ میں ایک توحید ہے جو قرآن کی روشنی میں تلاش کرنی ہے۔ کائنات کے ظاہری آثار سے نپٹنے کے لئے جو حرکات و سکنات کرنی ہیں، اُن کی بنیاد ایک توحید پر ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی "سُنّت" کی پیروی میں ماحول کے اندر تلاش کرنی ہے۔ یہ دونوں کوششیں ایک ہی ایمانی توحید کے ماتحت مسلسل جہاد کی شکل میں ہمیشہ جاری رہتی ہیں۔

۱۷۰۰ء میں حضرت عالمگیر اورنگزیب علیہ الرحمہ وفات پا گئے۔ ۱۹۰۷ء میں مسلمانوں نے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا۔ بیچ کے دو سو سال کی مدت کا وہ عرصہ ہے، جس میں ہمارے جداگانہ وجود کے آثار ہم سے چھن گئے۔ آثار یوں چھنے کہ حقیقت ہم نے بھلا دی تھی۔ سب سے پہلے ایمان گیا، پھر اخلاق گیا، تب سلطنت کو زوال آیا۔ تجارت چھنی، دولت گئی، عزت گئی، غیرت گئی، عفت بھولی، اب جان بھی خطرہ میں ہے۔

اِن دو سو سال میں یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ یہ ایسی عبرت آموز کہانی ہے جس کے موٹے موٹے واقعات پر نظر رکھنی چاہیے۔ اگر پتہ چل جائے کہ دادا نے کیسے ایک ایک کر کے جائیداد بگاڑی تھی تو شاید اس سے پوتے کو سنبھلنے میں مدد ملے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کس طرح ہر لغزش کی تہہ میں ایمان کی کمزوری کام کر رہی تھی۔ اُمت اپنا ایمان بھلا چکی تھی، توحید پیش نظر نہ تھی۔ کوئی عقبیٰ کی توحید بھولا، کوئی دُنیا کی توحید بھولا، کوئی دونوں کو الگ الگ رکھ کر دونوں کی باہمی توحید بھولا۔ اکثر کا مرض دونوں کے بین بین تھا۔

ہندوستان میں اِسلام کے دشمن، آفاتِ ششگانہ:۔

یہ تو دل کی بیماری تھی لیکن مریض کو کمزور دیکھ کر جو پسّو، کھٹمل اور دوسرے جراثیم خون چوسنے کو جسم میں داخل ہو گئے، اُن کی گنتی کرنے سے بھی مفید سبق ملتا ہے۔ ایمان کے زوال کے اسباب تو ہم اس فصل میں دیکھیں گے جس کا عنوان ہے "پاکستان بنے گا کیسے"؟ یہاں صرف اُن طاقتوں پر نظر ڈالنا ہے جو عالمِ اسباب میں اسلام کی دشمن ثابت ہوئیں۔

☆/☆/☆/☆

ششگانہ عناصرِ زوال

(۱) شریعت فروش:۔

اس فہرست میں پہلا نمبر شریعت فروشوں کا ہے۔ علمائے دین نے اسلام کی جو خدمات انجام دیں اور پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُن کی عزت وتکریم کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے اس سے کسی مسلمان کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح صوفیائے کرام نے ہندوستان میں جس طرح دین قائم کیا اُس کا منکر بھی کوئی بد بخت ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ آغازِ اسلام سے ہی یہودی، کبر اور چانکیہ کی اولاد فتنہ پرداز برہمنوں نے منافقت اور رافضیت سے اسی متبرک طبقہ کی تقدیس کی آڑ میں مسلمانوں کو منتشر کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ فروعی اختلاف کو بڑھا کر فرقے قائم کر دیئے۔ مسلّمات میں شبہ پیدا کر دیا۔ اسی دوران میں وہ پیٹ کے بندے بھی آ ملے جنہوں نے خانقاہ اور مدرسہ سے سیکھا ہوا علم اور معرفت دل و دماغ کی پرورش کے بجائے شکم پروری کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ یہ "شریعت فروش" اور "طریقت فروش" اپنی ناشائستہ حرکات سے ایک طرف تو عوام کو گمراہ کرتے رہے، دوسری طرف امّت کو علماء اور صوفیاء سے بدظن کر دیا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن میں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے فرمایا ہے کہ دُنیا کی تھوڑی سے پونجی کے عوض دین بیچ دیتے ہیں۔ خدا کی قسم ایسا خسارہ کا سودا کرتے ہیں۔ یہی وہ حضرات ہیں جو کبھی انگلستان کا نصرانی بادشاہ مر جائے تو اس کے لئے مسجدوں میں مغفرت کی دُعائیں کراتے ہیں، کبھی سود حلال قرار پاجاتا ہے، کبھی "جہاد" حرام ہو جاتا ہے، کبھی شہدائے کرام حرام موت مرنے والے قرار پاتے ہیں، کبھی فاسق وفاجر مسلمانوں کی مذمت کرتے کرتے کافروں کی بیعت کر لیتے ہیں، کبھی دین پر وطن کو غالب قرار دیتے ہیں اور کبھی "پرانے اسلام" کی جگہ "نیا اسلام" جاری کرنے کو "درسِ قرآن" اور "حلقۂ تلقین" کا ڈھونگ رچایا جاتا ہے۔

انہیں لوگوں کے رُوحانی آباؤ اجداد نے جزیہ اور گاؤکشی ہندوستان میں حرام قرار دیئے تھے۔ یہی ٹیپو سلطان شہیدؒ اور افغان مجاہدین کے خلاف سکھوں اور مرہٹوں کے حق میں فتوے دیتے تھے۔ انہوں نے ہی گزشتہ جنگِ عظیم میں ترکوں کے خلاف لڑنے کے لئے فتویٰ دیا تھا۔ ہندوستان میں اسلام کا خون چوسنے والے کیڑوں میں یہ چارپائی کے کھٹمل اور مارِ آستین نمبر ایک کا رُتبہ رکھتے ہیں۔

(۲) نواب:۔

اسلامی سوسائٹی میں ''درویش'' اور ''نواب'' متضاد الفاظ نہ تھے۔ مسلمان اُمراء اور منعم جہاں جسم کی آسائش وراحت کے لئے محلات اور باغات تعمیر کرتے تھے، حسن وموسیقی کا لطف اُٹھاتے تھے۔ اچھے اچھے لباس اور خوشبوئیں ایجاد کرتے تھے۔ وہاں علم اور اخلاق، تمدن اور سیاست بھی اُن کے مرہونِ منت تھے۔ خود ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں ایسے سینکڑوں نام شمار کئے جاسکتے ہیں جو بستر کے گداز، نغمہ کے ساز اور معرفت کے راز کے ساتھ ساتھ میدانِ جنگ میں شمشیر باز اور مجلسِ مشاورت میں رمز شناس بھی تھے۔

مرورِ ایام سے یا نفس کے غرور سے اشتہائیں مٹ گئیں اور شہوتیں باقی رہ گئیں۔ صحت کی پیاس پانی سے سیر ہو جاتی ہے لیکن مرض کی پیاس سیر کرنے سے اُلٹے بھڑکتی ہے۔ چنانچہ نوابوں کی بزم بھی رزم کے لئے تیار ہونے کے بجائے گھل گھل کر ختم ہونے کا سامان بن گئی۔ ہوس اور حرص نے انہیں قوم کا غدار اور دین سے بے پرواہ کر دیا۔ مُغلیہ سلطنت کے اختتام سے لے کر آج تک دیکھتے ہیں کہ لوگ اپنے جاہ ومنصب، شان وشوکت، شکاری کتوں اور ناچنے والیوں کی خاطر سلطنت، دین، وفا سب کچھ قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ قوم نے جو دولت اور ذہانت اُنہیں اپنی حفاظت کرنے کے لئے سونپی تھی وہ قوم پر حکومت جتانے اور اغیار کے ساتھ ساز باز کرنے میں صرف ہوتی ہے۔

سلطنت مغلیہ کو انہیں نواب صوبہ داروں نے اپنی خود غرضی سے ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ فرنگی اور مرہٹے سے اِن نوابوں نے سازش کر کے اُنہیں ملک میں داخل کیا۔ میر جعفر سے لے کر میر صادق تک سب نواب ہی تھے۔ آج بھی خضر حیات (سر خضر حیات ٹوانہ) سے لے کر نواب ڈھاکہ تک نواب ہی ہمارے انتشار کا باعث ہیں۔ سر فضل حسین اور سر سکندر (سر سکندر حیات خاں) بھی نوابوں ہی کی فہرست میں داخل ہیں جو ہمارے ہی لٹے ہوئے دسترخوان سے چند ریزے ہمارے سامنے ڈال کر ہمیں یقین دلاتے تھے کہ دیکھو! ہم تمہارے لئے کیا کیا خوانِ نعمت لائے ہیں۔

ہر وہ دولت مند مسلمان جو منصب دولت اور عیش کو دین اور ملت پر ترجیح دیتا ہے ''کلب الدولۃ'' کے خطاب کا مستحق ہے اور مندرجہ بالا معنوں میں نواب ہے۔

(۳) برہمن:۔

مصر کا بُت ابوالہول دُنیا کا سب سے قدیم عجوبہ تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن ہندوستان کو یہ فخر حاصل ہے کہ متھرا کے مہنتوں کی اولاد کی شکل میں یہاں دس ہزار سال پرانے بھوتوں کی ایک جیتی جاگتی نسل موجود ہے جس کا ''کالا علم'' آج بیسویں صدی میں بھی بڑے بڑے سفید اژدہاؤں کو اپنے منتر سے کیل ڈالتا ہے۔ ہاروت ماروت کے شاگرد اور یاجوج ماجوج کی اولاد یہ بڑے بڑے کانوں اور چپٹے خدوخال کے بوسیدہ چہروں والے جادوگر دُنیا کی قدیم ترین مخلوق جو محض باتیں بنا کر ہزاروں انسانوں پر پیدائشی حق سے حکومت کرتی ہے۔ یہ خود ہی ایک ''تھیوری'' تصنیف کرتی ہے اور خود کو اعلیٰ اور باقی سب کو ادنیٰ قرار دیتی ہے۔ پھر میٹھی میٹھی، چکنی چپڑی اور چھوٹی چھوٹی باتیں کر کے بلا مبالغہ کروڑوں انسانوں کو اُن لغویات کا یقین دلا دیتی ہے جن کا ذکر پہلی دفعہ اجنبی سُنے تو قہقہوں سے پیٹ میں بَل پڑ جائیں اور نفرت سے تھوکتے تھوکتے گلا خشک ہو جائے۔

یہ روائتی مغرور برہمن گوشت نہیں کھاتا لیکن خون پیتا ہے۔ اپنی جاتی سے باہر شادی نہیں کرتا لیکن وقت پڑنے پر بیٹی دے کر بھی گلا گھونٹنے سے دریغ نہیں کرتا۔ یہ اس کی ماچ نیتی ہے۔ خوف اور وہم اس کا دھرم ہے۔

ہندوستان میں جس نئی طاقت نے برہمن کے اقتدار میں خلل ڈالا اُس نے اُسی کے اندر شامل ہو کر اُسے فنا کر دیا۔ یونانی فلسفہ کو شکست دینے کے لئے برہمن چانکیہ نے شودر موریا کو سمراٹ بنانے سے دریغ نہ کیا۔ بدھ کی بُت شکنی کو شکست دینے کے لئے برہمن نے خود بدھ کی مورتی مندروں میں رکھ دی۔ مُغل آگئے تو مرزا بن گیا، انگریز پہنچے تو اسے مسٹر بننے میں دیر نہ لگی۔ تب فارسی قصیدے لکھ کر کام نکالتا، اب فصیح انگریزی میں کونسی ٹیوشنل نکات پر بیان دیتا ہے اور اخبارات نکال کر اُن میں شائع کراتا ہے۔

یہی برہمن مرہٹوں کا پیشوا بن کر انہیں مسلمانوں کے خلاف لایا کیونکہ اسلامی مساوات برہمن کے اقتدار کے منافی تھی۔ اسی نے ہون رچا کر سکھوں کے گرو گوبند سنگھ کو مغلوں سے لڑایا، یہی تھا جو امی چند بن کر سراج الدولہ کی تباہی کا باعث بنا، یہی ٹیپو سلطان شہید کا غدار مشیر مال تھا، اسی نے ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں جاٹ مل بن کر جاسوسی کی۔ اسی نے شیواجی کو گرو بن کر سوراجیہ کا سبق پڑھایا تھا اور یہی مہاتما بن کر عدم تشدد اور چرخے کی آڑ میں اسلامی علیحدگی ختم کرنا چاہتا ہے۔ شنکر اچاریہ کے صوبہ کے راجگوپال اچاریہ کی مدد سے ہمیں پاکستان سے ورغلانا چاہتا ہے۔

یہ کبھی انگریز کا سیکرٹری بن کر، کبھی دفتر میں کلرک اور ٹائپسٹ کا بھیس رچا کر اور کبھی اپنی بیٹی کے لبوں پر سُرخی لگا کر اچھی سی ساڑھی پہنا کر اور اُسے مسلمان سید حسین کے ساتھ امریکہ بھیج کر طرح طرح کے ڈھونگ رچاتا ہے۔ اس کے کاٹے کا علاج ہی نہیں۔ اس سے بچ کر رہنا چاہئے۔ یہی دُنیا کی ایک قوم ہے جو جسم ملا کر بھی دل جدا رکھ سکتی ہے۔

(۴) بنیا:۔

یہ برہمن کی طرح ہندو سوسائٹی کا پرانا رتن ہے۔ اسے دُنیا کی لذتوں اور رُوحانی مسرتوں سے کچھ سروکار نہیں۔ روپیہ جمع کرنا اور پھر اس روپے کو مزید روپیہ جمع کرنے میں صرف کرنا اس کی زندگی کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ لکشمی اس کی دیوی ہے۔ پنڈت جی سے مہاشے جی کا پُرانا یارانہ ہے۔ یہ اُس کو بھینٹ چڑھاتا ہے وہ اس کو آشیرباد دیتا ہے۔ بقدرِ ضرورت بقدرِ تجارت گاہک پھانسنے کو جائز عیاشی تصور کرتا ہے۔

مسلمان چونکہ اس دُنیا کو ذلیل اور اگلی دُنیا کو باقی رہنے والی مانتا ہے، اس لئے بنیا، مسلمان کے خون کا پیاسا ہے۔ (اس ملیچھ کا بس چلے تو سارا دھن یوں ہی اُجاڑ دے)۔ کھانے پینے اور صرف کرنے کے سوائے بینت کر رکھنا تو اسے آتا ہی نہیں۔ سب سے بڑی آفت یہ ہے کہ اس کے نزدیک سود حرام ہے۔ ملکیت کا تصور ہی اسلام میں کچھ عجیب ہے۔ مالک تو صرف اللہ ہے۔ باقی جو محنت کرے استعمال کرے۔ (گویا ہمارے باپ دادا نے ہمارے لئے جو دھن جمع کیا اُس پر ہمارا کوئی حق ہی نہیں)۔

یہ برہمن جتنا ذہین تو نہیں لیکن حریص بلا کا ہے۔ ہیمو بقال سے لے کر آج تک اس کی ہر کوشش اسلامی اقتدار کی تخریب پر ہی مذکور رہی۔ ''ٹاٹا'' اور ''برلا'' اسی کے بھائی ہے۔

(۵) فرنگی:۔

فرنگی کو عاقبت کی کچھ فکر نہیں۔ وہ صرف اس دُنیا کی لذتیں اور اقتدار چاہتا ہے۔ اس لئے اُس نے اس دُنیا کی طاقتوں کا مطالعہ خوب کر رکھا ہے۔ لیکن وہ جو کچھ چاہتا ہے اُس کے متعلق اُس کا ذہن بالکل صاف ہے۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے بس وہی کچھ چاہتا ہے۔ اِدھر اُدھر نہ بھٹکتا ہے اور نہ ناک ٹوئیاں مارتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گو ہم اُس سے اچھی چیزیں چاہتے ہیں لیکن ہماری چاہت کامل نہ ہونے کے باعث ہم بحیثیت مجموعی اُس کے مقابلہ میں خسارے میں رہتے ہیں۔ وہ گو ادنیٰ چیزیں چاہتا ہے لیکن پوری یکسوئی سے چاہنے کے باعث قریب قریب وہ سب اُسے مل

جاتی ہیں۔

جسم اُس کی تمام کائنات ہے۔ اس لئے وہ نسل کے اُصول کا سختی سے پابند ہے۔ وہ رنگدار نسلوں کی وجہ تخلیق ہی یہی سمجھتا ہے کہ اس کی حفاظت میں رہیں اور اس کے مقاصد پورے کریں۔ وہ اخلاق اور قانون حتیٰ کہ خدا پر عقیدہ کا مصرف بھی یہی خیال کرتا ہے کہ اُس کا اقتدار قائم رہے، اس کی ضروریات مہیا ہوں۔ وہ اپنے اقتدار کا سخت باغیرت محافظ ہے۔ اس دائرہ کے باہر کسی قسم کی بک بک کی جائے، اُسے بُرا بھلا کہا جائے اسے کچھ سروکار نہیں۔ وہ سُننے کو تیار ہے۔

اُس نے اِس ملک میں آتے ہی اُن مراکز پر ہاتھ صاف کیا جو اخلاقی طور پر اس کے اقتدار کے رقیب ہو سکتے تھے۔ پھر صنعت اور تجارت کو فنا کیا۔ اب وہ اس ہاتھ پاؤں ٹوٹی ہوئی لوتھ (لاش) پر پوری دلسوزی کے ساتھ آنسو بہاتا ہے، اُس کی تیمارداری میں اپنے شغل اور نیکنامی کا موقع پاتا ہے۔ وہ اس کے زخموں کے اندمال پر یوں خوشی سے اُچھلتا ہے گویا کوئی نئی تخلیق ہوگئی۔ لیکن اگر کہیں حقیقی زندگی کی نبض پھڑ کنے لگے تو فی الفور اس کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہیں اُس کا بے رحم ہاتھ پوری سختی سے گلا گھونٹنے سے پرہیز نہیں کرتا۔

اُس کا اقتدار ریلوے اسٹیشنوں، ڈاک بنگلوں، پولیس کے تھانوں، فوج کی چھاؤنیوں اور سلطنت کے وفادار آئی۔ سی ایس کی بدولت قائم ہے۔ سب کے پیچھے برطانوی بحری بیڑا برطانوی صنعت، برطانوی مشین گنیں، توپیں اور اب برطانوی فضائی بیڑا بوقتِ ضرورت مدد کو موجود ہیں۔ برطانوی مدبرین کا دماغ کٹھ پتلیوں کے تار ہلاتا ہے۔ باقی کام مقامی وفادار رئیس اور نمبردار خود بخود کر دیتے ہیں۔ یوں فرنگی کا اقبال ہمارے زوال پر قائم ہے۔

فرنگی کا نسخہ حکومت سادہ بھی ہے اور آسان بھی۔ پہلے جسم کی طاقت اور دماغ کی چال سے کھانے پینے کا سامان سب چھین لو۔ پھر بھوک کے ماروں کو بقدر ضرورت وہی سامان دے کر اُن سے جو چاہو کرواتے رہو۔ وہی کھانے پینے کا سامان اُن سے دوگنا حاصل کرلو۔ اُن کے اخلاق، دین، حتیٰ کہ فطرت تک کو بدل ڈالو۔ نوکری اُن کا معراج بن جائے۔ موت کا ڈر اور حاجت کا خوف اُنہیں جیتے جی مار ڈالے اور سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ محتاج رہیں۔ تمہیں اتنا کچھ کرنا کافی ہے باقی سب وہ خود اور اُن کی باہمی پھوٹ مکمل کر دے گی۔

مصیبت کے ماروں کو دل بہلانے کے لئے کچھ کھلونے بھی دے رکھے ہیں جہاں جی بہلتا رہے اور بد دل نہ ہو جائیں۔ الیکشن لڑ کر ایک دوسرے پر ڈھول اڑائیں۔ اسمبلیوں میں بیٹھ کر ہماری اجازت سے ہمیں بُرا بھلا کہہ لیں اور اس پر خوشی سے پھولے نہ سمائیں۔ ہم سے پوچھ کر

اخبار نکالیں اور اس میں دل کے راز افشاء کریں۔ ہم آزادی اور جمہوریت کا جو مفہوم بتائیں اُسی پر جانیں فدا کرتے رہیں۔ ایسے گانٹھ کے پکے اور عقل کے اندھے مستحق بھی اور کس بات کے ہیں؟ لیڈر سے لے کر مقتدی تک سب کاٹھ کے اُلّو بنے ہوئے ہیں۔ یوں کم بختوں کی بغاوتیں بھی اظہارِ وفاداری کی اِک ادا بن جائیں۔ جب گلے میں باہیں ڈال کر پیچھے ہٹیں تو بغلگیری اور مضبوط ہوتی ہے۔

(۶) بابو:۔

یہ وہ ذلیل مخلوق ہے جسے فرنگی کی پرورش نے بنئے یا نواب کے عروج تک نہیں پہنچایا۔ صرف اپنی تھوڑی سے چاشنی حضرت لنگور کی دُم پر لگا دی ہے جس سے یہ صاحب بہادر بنے پھرتے ہیں لیکن اُن کی اُچھل کود بھی مستی سے نہیں بلکہ دماغ کی خشکی پرمبنی ہے۔ کبھی انھیں آزادی کا بخار ہو جاتا ہے، کبھی جمہوریت کے دورے پڑتے ہیں، کبھی مزدور کی ہمدردی کے تے آنے لگتے ہیں، کبھی اصلاحِ معیشت و تمدن کے دست لگ جاتے ہیں۔ اخبارات کا مطالعہ آپ کی خاص عادت ہے۔ بزرگوں کو بُرا بھلا کہنے میں آپ کو ازحد لطف آتا ہے۔ آپ کے استدلال میں ممالکِ غیر کی تاریخ سے اکثر مثالیں نقل ہوتی ہیں، گو اپنے جدِّ امجد کا نام بھی یاد نہیں ہوتا۔ یہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ موقعہ پڑنے پر ہمیشہ سٹی گم بھول جاتے ہیں۔

اُنہوں نے اسلام اور مسلمانوں کو خود تو کوئی نقصان نہیں پہنچایا کیونکہ یہ کچھ کر ہی نہیں سکتے صرف زبانی بک بک کے گنہگار ہیں۔ لیکن یہ نقصان ضرور ہے کہ جو تعمیری قدم تجویز کیا جائے اُس میں اپنی کھچڑی پکانی شروع کر دیتے ہیں اور اپنی ہمہ دانی کے زُعم میں ساری تجویز کا ستیاناس کر ڈالتے ہیں۔

۱۷۰۷ء سے لے کر ۱۹۰۷ء تک کی تاریخی تقسیم:۔

یہ تو ہم نے اُوپر دیکھ لیا کہ ۱۷۰۷ء سے ۱۹۰۷ء تک وہ کیا اندرونی و بیرونی اسباب تھے جنہوں نے ہندوستان میں اسلام کے نام لیواؤں کو ذلیل کیا۔ اب ذرا تفصیل میں دیکھیں کہ ان دونوں اسباب نے کام کس طرح کیا۔ اس مقصد کے لئے ہم اس دو سو سال کے عرصہ کو چار طرح تقسیم کر کے اس پر نظر ڈالتے ہیں۔ پہلے تو یہ کہ اس دوران تختِ دہلی پر کون قابض رہا۔ یہ شاہی تقسیم ہوگی پھر یہ کہ صوبوں اور مختلف ریاستوں کی کیا کیفیت رہی۔ یہ صوبائی اور ریاستی تقسیم ہوگی۔ پھر یہ کہ کون کون سی نامور ہستیاں اپنی کارگزاری دکھا گئیں۔ یہ شخصی تقسیم ہوگی۔

شاہی تقسیم:۔

(۱) ۱۷۰۷ء میں حضرت اورنگ زیب عالمگیر علیہ الرحمۃ وفات پاتے ہیں۔ آپ کے آنکھیں موندتے ہی ایک طرف شاہزادہ اعظم شاہ اور دوسری طرف شاہزادہ کام بخش تخت پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن دونوں ناکام رہتے ہیں اور محمد معظم الملقب بہادر شاہ، شاہ عالم اوّل ایک مقتدر سردار ذوالفقار خاں کی مدد سے تخت نشین ہو کر ۱۷۱۲ء تک حکومت کرتے ہیں۔ انتظامِ حکومت ذوالفقار خاں کے ہاتھ رہتا ہے۔ ۱۷۰۷ء میں ہی حکومتِ برطانیہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقابلہ کی تمام انگریز کمپنیاں ختم کر کے اس کمپنی کو ہندوستان سے تجارت کا واحد ایجنٹ مقرر کرتی ہے۔

(۲) ۱۷۱۲ء میں شاہ عالم اوّل کا بیٹا جہاندار شاہ، ذوالفقار خاں کی مدد سے تخت نشین ہوتا ہے اور بمشکل ایک سال حکومت کرتا ہے۔ انتظامِ حکومت بدستور ذوالفقار خاں کے ہاتھ میں ہے۔

(۳) فرخ سیر بن شاہزادہ عظیم الشان بن شاہ عالم اوّل، شیعہ سیّد برادران حسین علی حاکم بہار اور عبداللہ حاکم الٰہ آباد کی مدد سے ۱۷۱۳ء میں جہاندار شاہ اور ذوالفقار خاں کو آگرہ کے قریب شکست دے کر دونوں کو قتل کروا ڈالتا ہے اور ۱۷۱۹ء تک حکومت کرتا ہے۔ انتظامِ حکومت سیّد برادران کے ہاتھ میں رہتا ہے۔

(۴) فرخ سیر، سیّد برادران سے اقتدار چھین لینے کی کوشش کرتے ہوئے ۱۷۱۹ء میں اُن کے ہاتھوں اپنی محل سرا میں گلا گھونٹ کر مار ڈالا جاتا ہے۔ شہزادہ رفیع الشان کا بڑا بیٹا رفیع الدرجات سیّد برادران کے اشارے سے تخت نشین ہوتا ہے لیکن دو تین مہینے حکومت کر کے ۱۷۱۹ء میں ہی تپ دق سے مر جاتا ہے۔ انتظامِ حکومت بدستور سیّد برادران کے ہاتھ ہے۔

(۵) شاہزادہ رفیع الشان کا دوسرا بیٹا اور رفیع الدرجات کا چھوٹا بھائی رفیع الدولہ ۱۷۱۹ء میں رفیع الدرجات کی موت کے بعد سیّد برادران کے اشارے سے تخت نشین ہوتا ہے لیکن دو تین مہینے حکومت کرنے کے بعد مرہٹوں کے مقابلہ کو لشکر لے کر نکلتا ہے تو میدانِ جنگ میں اپنے کیمپ کے اندر ۱۷۱۹ء میں ہی افیون خوری اور پیچش سے مر جاتا ہے۔

(۶) ۱۷۱۹ء میں رفیع الدولہ کی موت کے بعد سیّد برادران روشن اختر عرف محمد شاہ رنگیلا بن محمد اختر بن شاہ عالم اوّل کو تخت پر بٹھاتے ہیں اور وہ ۱۷۴۸ء تک حکومت کرتا ہے۔ اُس کی تخت نشینی کی تھوڑی مدت کے بعد ۱۷۲۰ء میں دوسرے سردار اکٹھے ہو کر سیّد برادران کو جو "بادشاہ گر" بھی

کہلاتے ہیں، شاہ پور کی لڑائی میں شکست دے کر قتل کر ڈالتے ہیں۔

(۷) ۱۷۴۸ء میں محمد شاہ رنگیلا مر جاتا ہے اور اُس کا بیٹا احمد شاہ تخت نشین ہو کر ۱۷۵۴ء تک حکومت کرتا ہے۔

(۸) ۱۷۵۴ء میں احمد شاہ کو معزول کر کے شاہ عالم اوّل کے پوتے عزیز الدین الملقب بہ عالمگیر ثانی کو تخت نشین کرتے ہیں۔ جو ۱۷۵۹ء تک حکومت کرتا ہے۔

(۹) عالمگیر ثانی کو ۱۷۵۹ء میں قتل کر ڈالتے ہیں اور محی الملت بہ شاہ جہان ثالث بن شاہزادہ کام بخش بن حضرت اورنگزیب عالمگیر کو تخت نشین کرتے ہیں جو ۱۷۶۰ء تک حکومت کرتا ہے۔

(۱۰) ۱۷۶۰ء میں شاہ جہاں ثالث کو معزول کر کے شاہزادہ علی گوہر کے لڑکے مرزا جیون بخش کو تخت پر بٹھاتے ہیں جو بمشکل ایک سال حکومت کرتا ہے۔

(۱۱) ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ ابدالی، عزیز الدین عالمگیر ثانی کے بیٹے جلال الدین عالی گوہر شاہ عالم ثانی کو تخت پر بٹھاتا ہے جو ۱۸۰۶ء تک حکومت کرتا ہے۔ اس دوران حکومت میں روہیلے اُس کی آنکھیں نکال کر اُسے اندھا کر ڈالتے ہیں۔ مرہٹے اُسے قید کر لیتے ہیں اور آخر کار انگریز اُسے اپنی "حفاظت" میں "پنشن" دے کر حکومت کراتے ہیں۔

(۱۲) ۱۸۰۶ء میں شاہ عالم ثانی مر جاتا ہے اور اس کا بیٹا اکبر شاہ ثانی بدستور انگریزوں کی حراست اور پنشن میں ۱۸۳۷ء تک تخت نشین رہتا ہے۔

(۱۳) ۱۸۳۷ء میں اکبر شاہ ثانی کا بیٹا سراج الدین ابو ظفر بہادر شاہ بدستور انگریزوں کی پنشن لیتے ہوئے ۱۸۵۸ء تک تخت نشین رہتا ہے۔ پھر ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد انگریز اُسے رنگون میں نظر بند کر دیتے ہیں۔

(۱۴) لارڈ کیننگ ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۲ء تک حکومت کرتا ہے۔ ملکہ وکٹوریہ یکم نومبر ۱۸۵۸ء کے اعلان سے "قیصرۂ ہند" کا لقب اختیار کرتی ہے۔ قانون شریعت اور صدر عدالت اور صدر نظامت منسوخ کر کے ۱۸۶۰ء میں لارڈ میکالے کی مدون کردہ تعزیزات ہند نافذ کی جاتی ہے۔ ۱۸۶۱ء میں ضابطہ فوجداری اور ضابطہ دیوانی عائد ہوتے ہیں۔ اسی سال انڈیا کونسل ایکٹ منظور ہوتا ہے جس کی رُو سے گورنر جنرل کی مجلس مشاورت میں غیر سرکاری اراکین بھی نامزد ہونے لگتے ہیں۔ اسی اصول نے آگے جا کر انگریزی اقتدار کا بیڑا غرق کرتا ہے۔

(۱۵) لارڈ الگن ۱۸۶۲ء سے ۱۸۶۳ء تک حکومت کر کے دھرم سالہ میں مر جاتا ہے۔ شمال

مغربی سرحدی صوبہ کے وہابی افغانوں کے خلاف مہم بھیجی جاتی ہے۔

(۱۶) سرجان لارنس پنجاب کی گورنری سے وائسرائے بن کر ۱۸۶۴ء سے لے کر ۱۸۶۹ء تک حکومت کرتا ہے۔ ۱۸۶۶ء میں اڑیسہ کے اندر وہ خوفناک قحط پڑتا ہے جس سے تیں لاکھ انسان مر جاتے ہیں۔

(۱۷) لارڈ میو ۱۸۶۹ء سے ۱۸۷۲ء تک حکومت کر کے جزائر انڈیمان میں شیر پٹھان کے ہاتھوں قتل ہوتا ہے۔ اس کے عہد میں صوبوں کو پانچ سالہ میعاد پر چند مدات مالیانہ سپرد کر دی گئیں یہی صوبجاتی خود مختاری کی ابتدا تھی۔

(۱۸) لارڈ نارتھ بروک ۱۸۷۲ء سے ۱۸۷۶ء تک حکومت کرتا ہے۔ ۷۴-۱۸۷۳ء میں اڑیسہ میں سخت قحط پڑتا ہے۔ ۷۶-۱۸۷۵ء میں شاہزادہ البرٹ ایڈورڈ پرنس آف ویلز جو بعد میں ایڈورڈ ہفتم بنا ہندوستان کا دورہ کرتا ہے۔

(۱۹) لارڈ لٹن ۱۸۷۶ء سے ۱۸۸۰ء تک حکومت کرتا ہے۔ مدراس اور دکن میں وہ خوفناک قحط پڑا تھا جس سے پچاس لاکھ سے زیادہ نفوس فاقہ کشی سے جان دیتے ہیں۔ ورنیکلر پریس ایکٹ ہندوستانی اخبارات کو حکومت کے خلاف لکھنے کی ممانعت کرتا ہے۔ ۱۸۷۷ء میں لارڈ لٹن مسلمانوں کو انگریز شناس بنانے کے لئے سرسید سے علی گڑھ اینگلو اورنٹیل کالج بنوا کر خود اُس کا سنگ بنیاد رکھتا ہے۔

(۲۰) لارڈ رپن ۱۸۸۰ء سے ۱۸۸۴ء تک حکومت کرتا ہے۔ لوکل سیلف گورنمنٹ کے لئے ڈسٹرکٹ بورڈوں اور لوکل بورڈوں کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ البرٹ بل سے پہلے ہندوستانی مجسٹریٹوں کو یوروپین مجرموں کے خلاف استغاثہ سماعت کرنے کے اختیارات دیئے جاتے ہیں۔ پھر یورپین طبقہ کے شور مچانے پر وہ اختیارات واپس لے لئے جاتے ہیں۔ لارڈ لٹن کا ورنیکلر پریس ایکٹ منسوخ کیا جاتا ہے۔ ۱۸۸۳ء سے آریہ سماج کا بانی سوامی دیانند مر جاتا ہے۔

(۲۱) لارڈ ڈفرن ۱۸۸۴ء نے ۱۸۸۸ء تک حکومت کرتا ہے۔ ۱۸۸۵ء میں "ہیوم" ایک سول سروس کا انگریز، بمبئی کے مقام پر "انڈین نیشنل کانگرس" کی بنیاد رکھتا ہے۔

(۲۲) لارڈ لینڈس ڈاؤن ۱۸۸۸ء سے ۱۸۹۴ء تک حکومت کرتا ہے۔ ۱۸۹۲ء میں انڈین کونسل ایکٹ نافذ کیا جاتا ہے۔ جس سے امپریل مجلس قانون ساز اور صوبائی مجالس قانون ساز کو بجٹ پر بحث کرنے اور سوالات دریافت کرنے کا حق دیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں کیمبرے کلاز کی رُو سے میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کو اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ وائسرائے کی خدمت میں نام تجویز

کرکے بھیجا کریں اور مجوزہ اصحاب سے کونسلوں کے اراکین مقرر ہوا کریں گے۔ چونکہ بورڈوں میں اکثریت سے الیکشن کا اصول نافذ تھا۔ اور سب غیر مسلموں سے بھرے پڑے تھے۔ لہذا کونسلوں میں بھی غیر مسلم نمائندے ہی تجویز ہوئے۔ اس سے مسلمان بھڑکے اور جداگانہ انتخاب کے مطالبہ کی بنیاد پڑی۔

(۲۳) لارڈ ایلگن ثانی ۱۸۹۴ء سے ۱۸۹۹ء تک حکومت کرتا ہے۔ ۱۸۹۶ء میں یوپی اور سی پی میں سخت قحط پڑتا ہے جس سے ساڑھے سات لاکھ انسان مرجاتے ہیں۔ قحط کا اثر دوسرے صوبوں تک پہنچتا ہے۔ ساتھ ہی بمبئی سے طاعون پھوٹتا ہے جس سے ہزاروں بے موت مرجاتے ہیں۔

(۲۴) لارڈ کرزن ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۵ء تک حکومت کرتا ہے۔ ۱۹۰۱ء میں ملکہ وکٹوریہ مرجاتی ہے۔ ۱۹۰۲ء میں دہلی میں ایڈورڈ ہفتم کی جانشینی کا دربار ہوتا ہے۔ جی کے گوکھلے سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کی بنیاد رکھتا ہے۔ تحریک امداد باہمی کی حکومت کی جانب سے بنیاد رکھی جاتی ہے۔ آبپاشی کی تجاویز طے پاتی ہیں۔ ۱۹۰۰ء میں قانون انتقال اراضی پنجاب منظور ہوتا ہے۔ ۱۹۰۴ء میں یونیورسٹی ایکٹ نافذ کیا جاتا ہے، محکمہ آثار قدیمہ قائم کیا جاتا ہے۔ ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگالہ کرکے آسام اور مشرقی بنگال کا ایک صوبہ بنایا جاتا ہے اور ڈھاکہ اُس کا دارالحکومت قرار پاتا ہے۔ اس طرح مُسلم مزارعین کے اُبھرنے کی توقع تھی۔ اس پر بنگالی ہندو تشدد اور سودیشی تحریک شروع کرتے ہیں۔

(۲۵) لارڈ منٹو ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۰ء تک حکومت کرتا ہے۔ ۱۹۰۶ء میں مُسلم لیگ کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ ۱۹۰۷ء میں انڈین نیشنل کانگرس کے سالانہ اجلاس سورت میں انتہا پسند عنصر کو کھلے اعتدال پسندوں سے شکست کھاتا ہے۔ ۱۹۰۸ء میں منٹو مارلے اصلاحات نافذ ہوتی ہیں جن میں پہلی مرتبہ جداگانہ انتخاب تسلیم کیا جاتا ہے۔

یہ ہے دوسو سال کی شاہی تقسیم۔ حضرت اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد پچیس انسان یکے بعد دیگرے دہلی کے اقتدار کی باگ ڈور سنبھالتے ہیں۔ ان میں سے پہلے ۱۳ منحوس عدو مُغلیہ تاجداروں کے بدنام کنندہ ہیں۔ پھر فرنگی برسر اقتدار آجاتا ہے۔ انصاف سے دیکھو، اُن ۱۳ میں سے سوائے محمد شاہ رنگیلا کے جس نے ۲۹ سال باپ دادا کی جمع جتھا اُجاڑی اور شاہ عالم ثانی کے جس نے ۴۵ سال اندھا، قیدی اور پنشن خوار بن کر تختِ دہلی کو ملوث کیا یا اکبر شاہ ثانی کے جس نے ۳۱ سال انگریزوں کے سایہ عاطفت میں پنشن کھائی اور سراج الدین ابوظفر بہادر شاہ کے جو بیس سال شاہ دہلی کے نام سے بدنام رہا باقی کسی کو چھ سال بھی حکومت کرنا نصیب

ہوئی؟ ان لوگوں کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے شکست کھائی تو مسلمانانِ ہند نے شکست کھائی؟ ہرگز نہیں۔ اسلامی نظام کو تو حضرت اورنگزیب عالمگیر کے بعد ہندوستان میں اپنے جوہر دکھانے کا موقع ہی نہ ملا۔ وہ تو محلات اور محل سراؤں کی سازشوں، عیش پرستیوں اور منصب اندوزیوں کا انجان ہی شکار ہوگیا۔ مسلمان بھوچکے ہی رہ گئے اور (۱) شریعت فروش (۲) نواب (۳) برہمن (۴) بنیے (۵) فرنگی اور (۶) بابو نے مل جل کر انہیں چکمہ ہی چکمہ میں نہ صرف لوٹ لیا بلکہ باندھ بھی لیا۔ باقی رہے بارہ (۱۲) فرنگی وائسرائے جن کی "برکات عہد انگلشیہ"، ریل، سڑک، ڈاکخانہ اور نہریں ہمارے بچوں کو آج تک اسکولوں میں رٹائی جاتی ہیں۔ ان بدبختوں نے سوائے قحط، طاعون، بے روزگاری اور بے حیائی کے اس ملک کو دیا ہی کیا ہے۔ مسلمان اس دوسو سال کی تاریخ کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ یہ ہماری ہوئی تھی ہی نہیں۔ اس میں جو کچھ ہوا وہ ہمیں پابند کرسکتا ہے۔ چھ لٹیرے ہمارے باپ دادا کو دھوکے ہی دھوکے میں لوٹ لے گئے۔ پھر مدرسے میں سے ہمارے "مولوی" کو نکالا، خانقاہ کو ہمارے "پیر" سے خالی کرایا، تخت پر سے ہمارے "بادشاہ" کو اُٹھایا۔ سب جگہ اپنے پہاڑے کے ٹٹو بھر دیے اور اب ہمیں کو اپنی کہی پڑھاتے ہیں۔ نہ بابا نہ! ہمیں یہ تعلیم منظور نہیں۔

صوبائی اور ریاستی تقسیم:۔

(۱) پنجاب:۔

۱۷۵۲ء میں محمد شاہ رنگیلا کا بیٹا احمد شاہ دہلی کے تخت پر تھا کہ احمد شاہ ابدالی نے حملہ کیا۔ دربار شاہی میں تو بُزدل بھرے ہی پڑے تھے۔ ملتان اور پنجاب کے صوبے ابدالی کے حوالے کرکے صلح کرلی۔ ۱۷۹۵ء میں ابدالی کا پوتا زمان شاہ لاہور سے کابل واپس جارہا تھا کہ کچھ توپیں جن میں مشہور توپ "زمزمہ" بھی تھی، دریائے جہلم میں بہہ گئیں۔ سکھوں کے ایک سولہ سالہ سردار رنجیت سنگھ نے یہ توپیں دریا سے نکلوا کر شاہ زمان کو خدمت میں نذر بھیج دیں۔ مُسلمان کا کیا ہے بخشش پر آئے تو سلطنتیں بخش دیں۔ شاہ زمان نے نوجوان سکھ سردار کو ۱۷۹۸ء میں لاہور کا گورنر بنادیا۔

۱۸۰۰ء میں رنجیت سنگھ نے موقعہ پاکر "مہاراجہ" کا لقب اختیار کیا اور خود مختار بن بیٹھا۔ یوں پنجاب اور ملتان سکھوں کے قبضہ میں رہے۔ حتیٰ کہ ۱۸۴۹ء میں انگریزوں نے پنجاب کا الحاق کرلیا۔ یہ پچاس سال کی سکھا شاہی کی داستان ہے۔

(۲) اودھ اور آگرہ:۔

۱۷۲۲ء میں محمد شاہ رنگیلا دہلی کے تخت پر تھا کہ اودھ اور بہار کا صوبہ دار نواب سعادت علی خان مطلق العنان بن بیٹھا۔ انگریز اُس کی اولاد سے آہستہ آہستہ علاقے چھینتے رہے۔ لیکن ۱۸۵۶ء تک صوبجات متحدہ کے نام سے آگرہ اور اودھ کا الحاق کرلیا گیا۔ یہاں سعادت علی خاں کی اولاد ہی نواب بنی رہی۔ نواب واجد علی شاہ جن پر اودھ کی نوابی ختم ہوئی اسی خانوادہ کے چشم وچراغ تھے۔ محمد شاہ رنگیلا کے بعد یہ صاحب اپنی ہوس پرستیوں کے لئے ضرب المثل ہیں۔ ۱۷۷۵ء میں وارن ہسٹنگز نے بنارس کا علاقہ اودھ سے چھین کر راجہ چیت سنگھ کو دیا۔ پھر اُس پر جرمانے کر کے زبردستی لوٹ مار سے رقمیں وصول کیں۔ بیگمات اودھ پر رُسوائے عالم مظالم بھی اسی سال اسی وارن ہسٹنگز نے ڈھائے تھے

(۳) بنگال:۔

۱۷۴۰ء میں محمد شاہ رنگیلا دہلی کے تخت پر تھا کہ نواب علی وردی حاکم بنگال وبہار مطلق العنان بن بیٹھا۔ ۱۷۵۶ء میں وہ مرگیا تو اُس کا نواسہ سراج الدولہ اُس کا جانشین مقرر ہوا۔ سراج الدولہ نے ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے مقام پر لارڈ کلائیو سے شکست کھائی اور تھوڑا عرصہ بعد اپنے غدار وزیراعظم میر جعفر کے لڑکے کے ہاتھوں قتل ہوا۔ سراج الدولہ کے بعد میر جعفر اور پھر میر جعفر کا داماد میر قاسم کچھ عرصہ بنگال کے نواب بنے رہے۔ ۱۷۶۴ء میں انگریزوں نے بکسر کی جنگ فتح کی۔ عہد نامۂ الٰہ آباد کی رُو سے بنگال واڑیسہ کی دیوانی عملداری چھپن لاکھ روپیہ سالانہ برائے نام باج مقرر کر کے شاہ عالم ثانی سے چھین لی۔ ۱۷۶۹۔۷۰ء میں بنگال میں وہ خوفناک قحط پڑا جس سے ایک کروڑ باشندگان فاقہ کشی سے مرگئے۔ ۱۷۷۲ء میں بنگال براہ راست انگریزی عملداری میں شامل کرلیا گیا۔

(۴) حیدرآباد دکن:۔

۱۷۲۴ء میں محمد شاہ رنگیلا دہلی کے تخت پر تھا کہ نواب نظام الملک آصف جاہ صوبہ دار حیدرآباد دکن مطلق العنان بن بیٹھا۔ آج تک اُسی کی اولاد ریاست کی حکمران ہے۔ پہلے نظام دکن مرہٹوں اور ٹیپو سلطان وغیرہ کے خلاف انگریزوں کے حلیف بن کر لڑتے رہے۔ اب ۱۷۸۹ء سے برطانیہ کے ماتحت ہیں۔

قومی تقسیم:۔

(۱) سِکھ:۔

سکھ کے لفظی معنی ہیں مُرید، شاگرد۔ اس مذہبی فرقہ کے بانی گورونانک تھے۔ آپ پنجاب کے ایک گاؤں تلونڈی میں ایک معمولی دوکان دار کے گھر ۱۴۶۹ء میں پیدا ہوئے۔ ہندوؤں کی توہم پرستی، بُت پرستی اور رُسوم پرستی سے آپ بیزار تھے۔ مُسلمان علمائے ظاہر بھی اپنی زبانی اور کتابی دلیلوں سے اُن کی تسکین نہ کرسکے۔ شروع میں آپ نے مسلمان اُستاد سے تعلیم پائی تھی۔ سنِ بلوغ کو پہنچتے ہی آپ کو کئی مسلمان فقراء سے نیاز کا موقعہ حاصل ہوا۔ آپ نے مکہ معظمہ پہنچ کر حج بھی کیا۔ بغداد شریف کی زیارت کی اور قسطنطنیہ پہنچ کر خلیفۂ اسلام کے دربار میں بھی حاضری دی۔ افغانستان، بلخ، ہرات اور دوسرے اسلامی مراکز کے صوفیائے کرام سے آپ نے بالمشافہ فیض حاصل کیا۔ چنانچہ آپ کی تعلیم توحید ورسالت کے حقیقی مفہوم کو تسلیم کرتی تھی۔ آپ نے کیس رکھنے، کچھا پہننے یا اور کوئی عجیب وغریب شکل بنانے کی تلقین نہیں کی۔ یہ سب آپ کے بعد کے جانشینوں کی ایجادات ہیں۔

آپ کی وفات کے بعد دس گورو آپ کے جانشین ہوئے۔ کچھ گوروؤں تک تو یہ کیفیت تھی کہ یہ لوگ بالکل مسلمان فقراء کی طرح رہتے تھے۔ مسلمان اُن کے دوست اور رفیق تھے۔ ہاں شریعت فروش اور نواب وضع کے مسلمانوں اور برہمن اور بنیا ٹائپ کے ہندوؤں سے ضرور ان کو نفرت تھی اور ان کے بُرے اعمال کی مذمت کی جاتی تھی۔ اس کے بعد کچھ تو نذر نیاز اور دولت کے اکٹھے ہونے سے ان گوروؤں میں رُوحانیت کے بجائے دُنیاوی وجاہت کا پہلو غالب ہوگیا اور کچھ اس وجہ سے برسراقتدار حکومت گو اسلامی اصولوں پر چلتی نہ تھی لیکن کہلاتی مسلمان تھی۔ سکھوں اور مسلمانوں میں مغائرت پیدا ہوتی گئی۔

یہ صورت حالات تھی جب گورو گوبند سنگھ ۱۶۷۵ء میں مسند نشین ہوئے۔ انہوں نے اسلامی اور ہندو اصولوں کے مخلوط سے ایک نیا دین ایجاد کیا۔ اس کے نئے ارکان مقرر کئے۔ پانچ ککے لازم قرار دیئے اور سکھ کے معنی بھی سنگھ سے بدل کر اس متصوفانہ تحریک کو ایک قطعاً نیا مذہبی فرقہ بنادیا۔

گورو گوبند سنگھ باوجود اس نئے مذہب کی داغ بیل ڈالنے کے مسلمانوں سے نہایت اچھے تعلقات رکھتے تھے۔ ان کی وفات کے سو سال بعد تک سکھ مختلف گروہوں میں بٹے رہے۔

اب چونکہ گورو کی شخصیت کا کوئی رہنما موجود نہ تھا اور مسلمانوں کی حکومتِ وقت بھی ان سے اچھا سلوک نہ کرتی تھی۔ برہمنوں اور بنیوں نے موقعہ پا کر اپنی روایتی سازشوں سے بتدریج سکھ تحریک کو اسلام کے مقابلہ پر لا کھڑا کیا۔ گائے کا احترام، دیوی دیوتاؤں اور مندروں کی پوجا اور ایسے ہی دوسرے کئی خرافات جن کو سکھ گورو مٹانا چاہتے تھے پھر سکھ پنتھ میں لا داخل کئے اور خود گوردواروں کے مہنت بن بیٹھے۔

۱۸۰۰ء کے قریب رنجیت سنگھ نے اپنے سیاسی اقتدار سے چند سال کے لئے ایک سکھ سلطنت قائم کر دی۔ موجودہ شکل میں سکھ مت کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ اپنے تئیں قائم بالذات دین تصور کرتا تھا لیکن ایک دینِ کامل کے لوازمات یعنی ایک مکمل شریعت اور نظامِ حکومت سے بے بہرہ تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہر مقتدر سردار اپنی صوابدید کے مطابق نظامِ حکومت قائم کرلیتا تھا جو بیشتر غلبہ نظام کی نقل پر مبنی ہوتا تھا۔

۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ مر گیا تو سلطنت بھی منتشر ہونے لگی۔ تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد کبھی ایک ٹولہ برسرِ اقتدار آکر دوسرے ٹولہ کے سرداروں کو قتل کر ڈالتا تھا، کبھی دوسرا فریق پہلے سے یہی سلوک کرتا تھا۔ سکھ فوج الگ بپھر رہی تھی۔ آخر سکھ سرداروں نے سکھ فوج سے نجات حاصل کرنے کی خاطر اُسے انگریزوں سے لڑا دیا۔ انگریزوں نے چند ہی خونریز جنگوں کے بعد رنجیت سنگھ کے بیٹے دلیپ سنگھ کو انگلستان روانہ کر دیا، خود لاہور پر قبضہ کرلیا اور ۱۸۴۹ء میں پنجاب کا انگریزی علاقہ سے الحاق کر لیا گیا۔

(۲) مرہٹے:۔

بمبئی کے پاس مہاراشٹر کے علاقہ میں مرہٹوں کی خودسر اور بہادر قوم آباد ہے۔ سولہویں اور سترہویں صدی میں بعض شعراء اور ہندو مذہبی پیشواؤں نے ان کے اندر مذہبی جوش پیدا کیا۔ سیوا جی نے ان مختلف پہاڑی قبائل کو ایک تنظیم کی شکل دی اور قدیم ہندو دھرم کے مطابق سلطنت کا انتظام قائم کیا۔ خاص مرہٹہ علاقہ ''سوارجیہ'' کہلاتا تھا۔ باقی علاقے مُغلیہ۔ ۱۶۸۰ء میں سیوا جی مر گیا تو مرہٹے مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ تاہم پیشواؤں نے جو برہمنوں کی نسل سے تھے مرہٹوں کی شیرازہ بندی قائم رکھی۔ ۱۷۲۰ء میں تیسرے پیشوا بالا جی باجی راؤ نے شاہ پور کی لڑائی میں سید برادران کے خلاف نظام الملک کی مدد کر کے محمد شاہ رنگیلا سے ستارہ اور پونا کے درمیانی اضلاع میں سوارجیہ اور دکن کے دوسرے علاقوں میں چوتھ اور سردیش مکھی کا حق حاصل کرلیا۔ جب مرہٹے تمام ہندوستان میں فتور مچاتے پھرتے تھے تو مسلمان امراء نے تنگ آکر

احمد شاہ ابدالی شاہ کابل کو ان کا استیصال کرنے کی دعوت دی۔ چنانچہ احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی تیسری لڑائی میں مرہٹوں کا کچومر نکال دیا۔ لیکن یہ پھر سنبھلے اور مختلف مرہٹہ سرداروں کی زیرِ قیادت ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ آخری، تیسری مرہٹہ جنگ کے اختتام پر انگریزوں نے ۱۸۲۰ء میں ہندوستان کے اندر منظم مرہٹہ قوت کا خاتمہ کر دیا۔

(۳) رُوہیلے:۔

یہ افغان قبائل تھے جو علی محمد کے ماتحت ۱۷۴۴ء میں روہیلکھنڈ میں آکر آباد ہو گئے۔ احمد شاہ ابدالی ۱۷۶۱ء میں ہندوستان سے جاتے جاتے ان کے سردار نجیب الدولہ کو شاہ عالم ثانی کا وزیر مقرر کر گیا۔ ۱۷۶۴ء میں انگریزوں نے شاہ عالم ثانی کو اپنا پنشن خوار بنا لیا تھا لیکن ۱۷۷۱ء میں مرہٹہ سرداروں نے شاہ عالم ثانی سے وکالتِ مطلق کے اختیارات حاصل کر کے اُسے دوبارہ تخت نشین کیا اور اُسے انگریزوں کی حفاظت سے نکال کر خود اس کے محافظ بن بیٹھے۔ ۱۷۷۸ء میں روہیلوں کو پھر کچھ عرصہ کے لئے دہلی پر اقتدار حاصل ہو گیا تو غلام قادر بن ضابطہ خان بن نجیب الدولہ نے شاہ عالم کی آنکھیں نکلوا دیں۔ مرہٹوں نے شاہ عالم ثانی کو روہیلوں کے پنجہ سے چھڑایا اور تب شاہ عالم ثانی ۱۸۰۳ء تک پھر مرہٹوں کے ہاتھ میں رہا۔ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے مرہٹوں کو شکست دے کر دلی فتح کر لی اور شاہ عالم پھر انگریزوں کی حفاظت میں آ گیا۔ روہیلوں کو پہلے نواب اودھ نے انگریزوں کے ساتھ مل کر ۱۷۷۴ء میں شکست دی اور اُن کے علاقہ پر قبضہ کرلیا۔ پھر مرہٹوں نے سندھیا کے ماتحت غلام قادر خاں کو قتل کر کے روہیلہ طاقت بالکل ختم کر دی۔

(۴) پنڈارے:۔

یہ بھی افغان قبائل تھے جو وسط ہند میں آباد ہو گئے تھے اور مرہٹوں اور راجپوتوں کی افواج کی حاشیہ برداری میں لوٹ مار کر لیا کرتے تھے۔ ۱۸۔۱۸۱۷ء میں مارکیس آف ہیسٹنگز نے ان کا خاتمہ کر دیا۔ ان کے سرداروں میں سے کریم خاں اور امیر خاں نے انگریزوں کی اطاعت کرلی اور چیتو خاں جنگلوں میں گم ہو گیا۔

(۵) انگریز:۔

انگریزوں نے ۱۶۰۰ء میں ملکہ الزبتھ سے باقاعدہ چارٹر لے کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعے ہندوستان سے تجارت شروع کی۔ ۱۷۴۴ء تک ان کی حیثیت محض تاجروں کی سی تھی۔ ۱۷۴۸ء سے لے کر ۱۸۴۸ء تک انہوں نے برطانوی سلطنتِ ہند قائم کی۔ اس دوران میں انہیں

پانچ مشہور جنگیں لڑنی پڑیں جن کے نام یہ ہیں۔ جنگِ کرناٹک، جنگِ بنگال، جنگ میسور، مرہٹوں سے جنگ اور سکھوں سے جنگ۔

۱۷۴۸ء سے لے کر ۱۸۴۸ء تک سو سال میں انگریز نے جنگیں لڑ کر جو سلطنت قائم کی، ۱۸۴۸ء سے ۱۹۴۸ء تک سو سال میں اس کو تباہ و برباد کرنے کے اسباب آہستہ آہستہ پرورش پاتے رہے۔ انگریزوں کو اپنے ہندوستانی حریفوں پر جو فتوحات حاصل ہوتی رہیں وہ صرف دو وجوہات پر مبنی تھیں۔ اول تو ارادی یکسوئی۔ ہندوستانی کبھی مذہب کے حامی تھے، کبھی ذاتی عروج چاہتے تھے۔ کبھی اپنے رقیبوں اور مخالفوں کو زک دینے پر تلے ہوئے تھے۔ لیکن انگریز کا ذہن صاف تھا۔ وہ صرف اپنا قومی اقتدار چاہتا تھا۔ اور اپنی ملکی تجارت کا پھیلاؤ۔ اُس کے سوا وہ کسی قسم کے توہمات یا خبط میں مبتلا نہ تھا۔ ان دو مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے جو کچھ بھی کرنا لازم ہوتا وہ اُسے سرانجام دیتا۔ نہ دشمن کی دشمنی اس میں حائل تھی نہ دوست کی دوستی۔ ایک مستقل اور واضح اصول سامنے تھا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ اس ارادی یکسوئی سے فوجی اور انتظامی نظام میں بھی یکسوئی تھی۔ تعجب ہے کہ جو سکھ یا مرہٹے یا افغان اپنی فوجوں میں ضبط و نسق کے ابتدائی لوازم بھی پورے نہ کرتے تھے وہی انگریز کے نوکر ہو کر فوجی اور انتظامی نظام کے سختی سے پابند ہو جاتے تھے۔ انگریزی فوج حملہ کرتی تھی تو ایک مرکزی نظام کے ماتحت۔ توپیں چلتی تھیں تو ایک نشانے پر اور نظم و نسق کی پالیسیاں بھی ایک ہی مقصد کے ماتحت تھیں۔ برعکس اس کے دیسی دماغ جیسے مقاصد میں پچوں پچوں کا مربہ تھے ویسے ہی فوجی داؤ پیچ بھی مذبذب، متضاد اور غیر مستقل ہوتے تھے۔

۱۸۴۸ء سے لے کر ۱۹۴۸ء کے سو سال میں انگریز کی ارادی یکسوئی آہستہ آہستہ ڈھیلی پڑ گئی۔ کبھی وہ کہتا تھا میں ہندوستانیوں کو خود اپنے اُوپر راج کرنے کے قابل بنانے کو یہاں بیٹھا ہوں۔ کبھی سوچتا تھا کہ خون کی قربانی دے کر ملک فتح کیا ہے کیوں چھوڑوں۔ کبھی عذر ہوتا تھا کہ میں تو چھوڑ دوں دوسرے غصب کر لیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ میدان جنگ توپ تفنگ سے ہٹ کر دلیل بازی اور بحث مباحثہ کا رنگ اختیار کرتا گیا۔ گو اب بھی انگریز یکسوئی، ارادہ اور سامان دونوں میں ہندوستانیوں کے مقابلہ میں طاقت ور ہے اور اسی لئے وہ ابھی تک یہاں حکمران بنا بیٹھا ہے۔ لیکن ذہن کے شہر پناہ میں رخنے پڑ چکے ہیں۔ ہم اپنی یکسوئی ایمان اور جہاد میں پختہ کر لیں تو فتح سامنے ہے۔

اب وہ جنگیں اور لڑائیاں شمار کریں جن سے ۱۷۴۸ء سے لے کر ۱۸۴۸ء تک انگریز

نے سلطنت ہندوستان کی بنیاد رکھی۔

I جنگِ کرناٹک:۔

(۱) پہلی لڑائی ۱۷۴۴ء سے لے کر ۱۷۴۸ء تک:۔

(الف) اس لڑائی کا اوّل معرکہ مدراس پر ہوا۔ جہاں انگریزوں نے قلعہ اور تجارتی بستی قائم کر رکھی تھی۔ ابتداء اس کی یوں ہوئی کہ اس وقت فرانسیسی مقبوضات کا گورنر ڈوپلے تھا۔ ۱۷۴۰ء میں یورپ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے مابین آسٹرین تخت نشینی پر جنگ شروع ہوئی تو فرانسیسی بیڑے نے مدراس پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ انوارالدین نواب کرناٹک نے خود مدراس پر قبضہ کرنے کی نیت سے دس ہزار سپاہ بھیجی۔ لیکن تربیت یافتہ فرانسیسیوں نے اس کا قلع قمع کر دیا۔

(ب) انگریزوں نے جوابی حملہ کے طور پر فرانسیسیوں کے دارالحکومت پانڈیچری کا محاصرہ کیا لیکن شدید نقصان اُٹھا کر واپس لوٹنا پڑا۔ یوں پہلے دونوں معرکوں میں فرانسیسیوں کا پلہ بھاری رہا۔

(ج) لیکن جب ایلاشپل کے معاہدے سے ۱۷۴۸ء میں یورپ میں فرانسیسیوں اور انگریزوں میں صلح ہوئی تو مدراس انگریزوں کو واپس مل گیا۔

(۲) دوسری لڑائی ۱۷۴۹ء سے لے کر ۱۷۵۴ء تک:۔

(الف) ۱۷۴۸ء میں نظام الملک آصف جاہ عالم ضعیفی میں مر گیا۔ اُس کی جانشینی کے لئے اُس کے بیٹے ناصر جنگ اور پوتے مظفر جنگ میں چل گئی۔ انہیں دنوں ہمسایہ ریاست کرناٹک کے نواب انوارالدین کے مقابلہ میں چندا صاحب ایک اور نواب نے علمِ بغاوت بلند کیا۔ مظفر جنگ نے چندا صاحب سے اتحاد کر کے فرانسیسی گورنر ڈوپلے سے امداد کی درخواست کی۔ ڈوپلے نے بخوشی مدد کی۔ چنانچہ مظفر جنگ، چندا صاحب اور فرانسیسی تینوں نے مل کر انوارالدین نواب کرناٹک کو ۱۷۴۹ء میں شکست دی اور مار ڈالا۔ انوارالدین کا بیٹا محمد علی ترچنا پلی میں بھاگ گیا۔

(ب) انگریزوں نے فرانسیسیوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے خوف کھا کر انوارالدین کے بیٹے محمد علی اور ناصر جنگ کی حمایت کا بیڑا اُٹھایا۔ ناصر جنگ نے انگریزوں کی مدد سے چندا صاحب کو شکست دی اور مظفر جنگ کو بھی قید کر لیا۔

(ج) فرانسیسی جرنیل بُسّے نے ناصر جنگ کو شکست دے کر مار ڈالا اور مظفر جنگ کو حیدر آباد دکن کا نظام بنا دیا۔ کچھ عرصہ بعد مظفر جنگ مارا گیا تو بُسّے نے نظام الملک کے ایک دوسرے بیٹے صلابت جنگ کو نظام بنا دیا۔

(د) اس نازک صورت حالات میں کمپنی کا ایک ملازم رابرٹ کلائیو جو پہلے کلرک کے طور پر ملازم ہو کر آیا تھا لیکن اب فوج میں داخل ہو گیا تھا، انگریزوں کے آڑے آیا۔ اُس وقت چندا صاحب نے ترچنا پلی کے قلعہ میں محمد علی کو محصور کر رکھا تھا۔ کلائیو نے چندا صاحب کے دار الحکومت آرا کوٹ پر براہ راست حملہ کر دیا۔ چندا صاحب نے ترچنا پلی سے کچھ فوجیں اپنے دار الحکومت کی حفاظت کے لئے بھیج دیں۔ ترپن (۵۳) روز تک کلائیو نے ان فوجوں کا مقابلہ کیا۔ پھر اُسے مدراس سے مدد پہنچ گئی۔ کلائیو نے چندا صاحب کے بیٹے راجہ صاحب کو آرنی اور کویری پک کے مقامات پر شکست دے دی۔ پھر وہ کچھ اور فوج لے کر ترچنا پلی کی مدد کو پہنچ گیا۔ چندا صاحب کو ترچنا پلی کا محاصرہ اُٹھا کر بھاگنا پڑا۔ راجہ تنجور نے چندا صاحب کو مار ڈالا۔

(ر) اسی اثناء میں انگریزوں نے فرانس کی حکومت سے براہ راست ساز باز کر کے ڈوپلے کو واپس فرانس بھجوا دیا۔ آخر ۱۷۵۵ء میں صلح نامہ پانڈیچری کی رو سے فرانسیسیوں نے محمد علی کو نواب کرناٹک تسلیم کر لیا اور جانبین نے ایک دوسرے کے مفتوحہ علاقے واپس کر دیے۔

(۳) تیسری لڑائی ۱۷۵۸ء سے لے کر ۱۷۶۱ء تک:۔

(الف) ۱۷۵۶ء میں یورپ میں فرانسیسیوں اور انگریزوں کے درمیان جنگ ہفت سالہ کے سلسلہ میں ٹھن گئی تو فرانسیسیوں نے کاؤنٹ لاآلی کو گورنر اور کمانڈر انچیف بنا کر ۱۷۵۸ء میں انگریزوں سے صلح پانڈیچری کا انتقال لینے بھیجا۔ لاآلی نے پہلے قلعہ سینٹ ڈیوڈ فتح کر لیا۔ پھر تنجور فتح کرنا چاہا لیکن ناکام رہا۔ اس مرحلہ پر اُس نے بُسّے کو شمالی سرکار (نظام حیدر آباد کے ایک علاقہ کا نام) سے اپنی مدد کو بلا لیا۔ اس سے کلائیو کو موقع ملا اور اُس نے شمالی سرکار کو فتح کر کے نظام دکن کو اپنے ساتھ ملا لیا۔

(ب) لاآلی اور بُسّے نے مل کر مدراس پر حملہ کر دیا اور دو مہینہ کے محاصرہ کے بعد شہر پر حملہ بولنا ہی چاہتے تھے کہ انگریزی بحری بیڑے کی مدد آ پہنچی اور ان دونوں کو بھاگنا پڑا۔

(ج) ۱۷۶۰ء میں سر آئر کوٹ نے وندواش کے مقام پر فرانسیسیوں کو سخت شکست دے کر بُسّے کو قید کر لیا۔

(د) لاآلی واپس فرانس چلا گیا جہاں اُس پر مقدمہ چلا کر اُسے سزائے موت

دے دی گئی۔

یوں انگریزوں نے ۱۷۴۴ء سے لے کر ۱۷۶۱ء تک جنگ کرناٹک جیت کر ہندوستان میں پاؤں جمانے کی خاطر اپنے یورپین حریف فرانسیسیوں کو میدان سے ہٹا دینے کا پہلا مرحلہ طے کر لیا۔ فرانسیسیوں کی شکست کی کئی وجوہات تھیں:۔

اوّل تو فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقابلے میں انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس سرمایہ بھی زیادہ تھا اور انگریز فرانسیسیوں کی نسبت اپنی کمپنی میں دلچسپی بھی زیادہ لیتے تھے۔

دوم:۔ انگریزوں کی خانگی حکومت مضبوط تھی اور انگلستان کا وزیر اعظم پٹ، کلائیو کی پوری مدد کرتا رہا۔ فرانس کی خانگی حکومت میں ہلچل تھی۔ پہلے انہوں نے ڈوپلے جیسے لائق شخص کی پشت پناہی سے دریغ کیا۔ پھر لاآلی کو ذرا شکست ہوئی تو ہندوستان سے منہ ہی موڑ لیا۔

سوم:۔ انگریزوں کی بحری طاقت فرانسیسیوں سے زیادہ مضبوط تھی اور انہیں گھر سے باقاعدہ مدد ملتی رہتی تھی۔

چہارم:۔ انگریز اپنی مصنوعات ہندوستان میں لا کر اپنی تجارت کو ترقی دیتے رہے۔ برعکس اس کے فرانسیسیوں کے پاس ایسی مصنوعات کی کمی تھی۔

پنجم:۔ انگریزوں کو کلائیو جیسا دور اندیش نمائندہ مل گیا تھا جس نے ۱۷۵۸ء میں لاآلی کی آمد سے پیشتر ہی ۱۷۵۷ء میں بنگال فتح کر کے ہندوستان میں پاؤں جما لئے تھے اور اب وہ خود اپنے بل پر کھڑا ہو سکتا تھا۔

II جنگِ بنگال:۔

(۱) پلاسی کی لڑائی ۱۷۵۷ء:۔

دراصل ہندوستان میں انگریزی سلطنت کا بانی رابرٹ کلائیو تھا جس نے ایک طرف جنگِ کرناٹک فتح کر کے فرانسیسیوں کو ہندوستان سے بے دخل کر دیا اور دوسری طرف جنگِ بنگال سے ہندوستان کے داخلی معاملات میں ہاتھ ڈالنے کا موقع پیدا کر لیا۔

(الف) ۱۷۵۶ء میں جب یورپ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے مابین جنگ ہفت سالہ کے سلسلہ میں ٹھن گئی تو اس جنگ کے بہانے انگریزوں نے بنگال کے قلعہ فورٹ ولیم جو کلکتہ کے قریب اُن کی تجارتی کوٹھی کی حفاظت کے لئے دیر سے چلا آ رہا تھا اب مسلح کرنا شروع کر دیا۔ نیز انہوں نے سراج الدولہ نواب بنگال کے ایک زیر عتاب مفرور شخص کو اپنے ہاں پناہ بھی

دے دی۔

نواب نے انگریزوں کی ان حرکات سے مشتعل ہو کر انہیں حکم دیا کہ قلعہ کے نئے استحکامات مسمار کر دیئے جائیں اور مفرور کو نواب کے حوالے کر دیا جائے۔ انگریزوں نے نہ تو قلعہ کے جدید استحکامات مسمار کئے اور نہ مفرور کو نواب کے حوالے کیا۔ کرناٹک کی پہلی دو لڑائیوں میں فرانسیسیوں کو زک دے کر وہ اپنی قوت سے خوب واقف ہو چکے تھے۔

اس پر نواب سراج الدولہ نے پہلے تو قاسم بازار (کلکتہ کے قریب ایک انگریزی تجارتی کوٹھی) لوٹ لی، پھر کلکتہ پر براہ راست حملہ کیا۔ یہاں کے گورنر ڈریک صاحب جہاز پر بیٹھ کر بھاگ گئے۔ باقی کے انگریزوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

(ب) جب اس شکست کی خبر مدراس پہنچی جو اس وقت تک ہندوستان میں انگریزوں کا مرکز تھا تو وہاں سے امیر البحر واٹسن اپنے بیڑے سمیت اور رابرٹ کلائیو اپنا لاؤ لشکر لے کر کلکتہ پر حملہ آور ہوئے۔ ۲/جنوری ۱۷۵۷ء کو کلکتہ انہوں نے باآسانی فتح کر لیا۔ اگلے ہفتے ہگلی پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا۔ سراج الدولہ نے انگریزوں کی منہ مانگی شرطیں منظور کر کے اُن سے صلح کر لی۔

(ج) رابرٹ کلائیو نے اُس وقت تو مصلحت دیکھ کر صلح کر لی لیکن بھیڑیا کے منہ کو لہو لگ چکا تھا اور اب وہ واپس جانے والا نہ تھا۔ اُس نے سارے بنگال پر تسلط جمانے کی ٹھان لی۔ ایک دولت مند بنیئے امی چند کی وساطت سے سراج الدولہ کی افواج کے تنخواہ تقسیم کرنے والے میر جعفر سے سازش کی۔ میر جعفر رشتہ میں تو سراج الدولہ کا ماموں تھا لیکن وہ خود نواب بنگال بننا چاہتا تھا۔ ایک مرحلہ پر امی چند نے مطالبہ کیا کہ رابرٹ کلائیو اور میر جعفر کے مابین جو سازش کا معاہدہ کیا جا رہا ہے اس میں یہ بھی لکھا جائے کہ سازش کی کامیابی پر امی چند کو تیس لاکھ روپے ملیں گے ورنہ وہ سارا بھانڈا پھوڑ دے گا۔ کلائیو نے لوہے کو لوہا کاٹتا ہے کے اصول پر معاہدہ کی دو نقلیں تیار کیں۔ ایک تو سفید رنگ کے کاغذ پر جو اصلی تھی، دوسری سرخ رنگ کے کاغذ پر جو کہ جعلی تھی اور جس میں امی چند کا ذکر موجود تھا۔ امی چند کو سُرخ معاہدہ دکھا کر مطمئن کر دیا گیا۔ امیر البحر واٹسن نے جعلی کاغذ پر دستخط کرنے سے انکار کیا تو کلائیو نے خود واٹسن کے جعلی دستخط کر دیئے۔

ان سازشوں کی اُڑتی اُڑتی خبر سراج الدولہ کو پہنچی تو اُس نے فرانسیسیوں سے رجوع کیا اور ان کو دعوت دی کہ وہ ہگلی پر حملہ کر کے انگریزوں کو بنگال سے نکال دے لیکن قبل اس کے کہ فرانسیسی اُس کی مدد کو پہنچے انگریزوں نے سراج الدولہ کو ٹھکانے لگا دیا۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ اوّل تو سراج الدولہ کو اپنے ماموں میر جعفر کی پوری سازشوں کا علم نہ تھا۔ پھر امی چند نے طفل

تسلیوں سے نواب کو اور بھی غافل کر دیا۔

۲۳/جون ۱۷۵۷ء کو کلائیو نے نواب سراج الدولہ کو ایک لمبا چوڑا خط لکھ کر اس پر کئی الزامات لگائے۔ اُلٹا اُسی کو حال ہی کے صلحنامہ کی معاہدہ شکنی کا ملزم گروانا اور اُسی روز اپنی تین ہزار فوج لے کر نواب کے دارالحکومت مُرشد آباد پر حملہ کر دیا۔ میر جعفر سے یہ پہلے طے پا چکا تھا کہ وہ عین میدان جنگ میں فوج کا ایک حصہ لے کر انگریزوں سے آ ملے۔ پلاسی کے قصبہ کے قریب سر آئر کوٹ نے نواب کی افواج پر جن میں پچاس ہزار پیادہ اور اٹھارہ ہزار سوار تھے، حملہ کر دیا۔ میر جعفر حسب وعدہ انگریزوں سے آ ملا۔ نواب کو شکست ہوئی اور وہ میر جعفر کے لڑکے کے ہاتھوں قتل ہوا۔ میر جعفر نے کلکتہ کے قریب چوبیس پرگنوں میں انگریزوں کو وہاں کا اعلیٰ زمیندار تسلیم کر لیا۔ کلائیو اور اُس کے دوستوں کو بیش قیمت تحائف اور رقم بطور رشوت دیں۔ انگریزوں نے اُسے بنگال کا نواب مقرر کر دیا۔

پلاسی کی جنگ کا مطالعہ اس لحاظ سے نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہے کہ یہاں پہلی مرتبہ "**فرنگی**" "**نواب**" اور "**بنیا**" کا وہ گٹھ جوڑ ظہور میں آیا جس نے اگلے سو سال میں کئی مرتبہ دہرایا جاتا تھا۔ یہی سازش بار بار ہندوستانی مسلمانوں کی شکست کا باعث ہوئی۔ گو شخصیتیں بدلتی رہیں لیکن تہہ میں وہ شیطانی قوتیں کام کرتی تھیں۔ ایک "**برھمن**" یا "**بنیا**" اسلام دشمنی میں کچھ منافق **نوابوں کو** "**فرنگی**" سے لا ملاتا ہے اور یوں "**مسلمان**" شکست کھا جاتا ہے۔

دوسرا سبق جو پلاسی کی جنگ سے ملتا ہے وہ سراج الدولہ کی یہ غلطی ہے کہ بجائے اندرونی دشمن یعنی منافق نوابوں سے پہلے نپٹنے کے وہ انگریزوں کے خلاف اپنا غصہ ضبط نہیں کر سکا اور یوں دونوں کو مل کر اُسے تباہ کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔

تیسرا سبق یہ ہے کہ "**بنیا**" یا "**برھمن**" کو اپنے مفاد کے لئے "**فرنگی**" کے دلال کا کام کرتا ہے لیکن جعلسازی و دغابازی اور مکاری میں فرنگی ہمیشہ اس سے بازی لے جاتا رہا ہے اور یوں اسے اپنے فریب کا پورا پھل کبھی نہیں ملتا بلکہ ہمیشہ فرنگی دونوں جانب سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

آگے جا کر ہم دیکھیں گے کہ سلطان ٹیپو نے بھی یہی غلطی کی۔ بجائے ملکی دشمن "**بنیے**" اور "**نواب**" سے پہلے نپٹنے کے فرنگی کے خلاف غصہ نکالنا چاہا۔ نتیجہ یہ کہ فرنگی جو دونوں کی نسبت زیادہ ہوشیار، چوکنا اور طاقتور تھا "**مسلمان**" کو تباہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

یہی غلطی آج وہ مسلمان کرتے ہیں جو پاکستان کے حصول میں **"نــــواب"** (یعنی داخلی منافق مسلمان دشمنوں) اور برہمن اور بنیے کا قلع قمع کرنے سے پہلے "انگریز" سے ٹکر لینا چاہتے ہیں۔

چوتھا سبق یہ تھا کہ سراج الدولہ نے **"بـنـئـیـے"** اور **"نواب"** سے غافل ہو کر **"انگریز"** کے خلاف فرانسیسی پر بھروسہ کیا۔ فرانسیسی اول تو انگریز کی ٹکر ہی کا نہ تھا۔ دوسرے **"نواب"**، **"بـنـئـیـے"** اور **"فرنگی"** تینوں کا مل کر گٹھ جوڑ اتنا قوی بن جاتا ہے کہ ان دو ملکی اور ایک غیر ملکی طاقتوں کے اتحاد کا مقابلہ ایک ملکی اور ایک غیر ملکی طاقت کبھی نہیں کر سکتے۔ یہی مصیبت ٹیپو سلطانؒ کو پیش آئی جبکہ اس نے دکن کے **"نواب نظام"**، مرہٹوں کے **"برہمن"** اور **"بـنـیـوں"** سے غافل ہو کر فرانس کی مدد سے انگریز کو شکست دینی چاہی۔ نظام اور مرہٹوں نے انگریز کی پوری دستگیری کی اور ٹیپو، نپولین کی مدد کے انتظار میں ہی مارا گیا۔

یہی صورت حالات ہمیں آج درپیش آتی ہے جب **"فـــرنـگـــی"** اور **"چھوٹو رام"** اور **"سـرفـضـل حسـیـن"** "مل کر پہلی مرتبہ مسٹر جناح کو شکست دیتے ہیں، دوبارہ "خضر حیات ٹوانہ"، "چھوٹو رام" اور "فرنگی" مل کر پھر مسلم لیگ کو شکست دیتے ہیں اور سہ بارہ "گاندھی"، "ابوالکلام آزاد"، اور "خضر حیات ٹوانہ" کی قماش کے نوابوں سے مل کر پاکستان کی تحریک کو کچلنا چاہتے ہیں۔

"فرنگی"، "بنیے" اور "نواب" کے اس گٹھ جوڑ کا صرف ایک ہی علاج ہے وہ یہ کہ پہلے منافق "نواب" کا خاتمہ کیا جائے۔ "فرنگی" اور "بنیا برہمن" اپنی خود غرضی کی عادت سے مجبور کھڑے تماشا دیکھا کریں گے اور اگر ہم انہیں وقتی طور پر تھپکا تھپکا کر غافل رکھیں تو یہ ایک جائز چال ہوگی۔ منافق اور اندرونی دشمن "نواب" کو ختم کرنے کے بعد ہم اس پوزیشن میں ہو سکتے ہیں کہ "فرنگی" یا "بنیا برہمن" میں سے کسی ایک کے ساتھ مل کر دوسرے کو شکست دیں۔ اس سے قبل شطرنج کی بازی ہمیشہ ہمارے خلاف رہے گی جیسے گزشتہ دو سو برس وہ ہمارے خلاف رہی ہے۔ کیونکہ منافق نواب اپنے خلاف اسلام مفاد کے باعث ہمیشہ اسلام کے خلاف ہی رہے گا۔ کبھی ہمارا دوست نہیں بن سکتا اور بنے گا تو ہماری اسلامی فطرت کو شکستہ کرے گا۔ مرتد کافر سے زیادہ خطرناک ہے اور اسی لئے اسلام نے اس کے قتل کا حکم دیا ہے۔ حالانکہ کافر کو قتل کرنا لازمی نہیں جب تک وہ کفر کے علاوہ کوئی گشتنی جرم نہ کرے۔

پانچویں سبق کا ہم بالا جمال پہلے کچھ ذکر کر چکے ہیں۔ وہ یہ کہ انگریز کی ارادی یکسوئی

کے باعث اس کے فوجی انتظامات بھی بہتر تھے، اس کی تمام افواج بارکوں میں رہتی تھی۔ روزانہ باقاعدہ ڈرل اور تنخواہ اور خوراک سے لے کر ترقی تک ہر معاملہ میں اپنے افسران کے ماتحت رہ کر وہ اطاعت شعار اور نظام شناس بن جاتی تھی۔ برعکس اس کے دیسی فوجیں اول تو علیحدہ علیحدہ سرداروں کی جاگیروں میں بٹی رہتی تھیں۔ وہاں ناز برداری، خوشامد اور قواعد شکنی کے خوب موقعے ملتے تھے۔ ترقی اور ناموری نظام کی پابندی سے نہیں بلکہ نظام کو توڑ کر رعایت سے حاصل ہوتی تھی۔ دوسرے اُن کی وفاداری اپنے فوری بالائی افسر سے تھی نہ کہ کسی ہمہ گیر نظام اور اصول و قواعد کے مجموعے سے۔ اس سے تعابت اور حسد کے موقعے پیدا ہوتے تھے۔ یہی فوجی کمزوریاں آئندہ سلطان ٹیپوؒ کے لئے بھی شکست کا سامان بنیں۔ اسی کے ساتھ سلطنت کے مالی نظام کی کمزوری بھی مسلمانوں اور دوسرے دیسی حکمرانوں کے خلاف تھی۔ انگریزی سرکاری روپیہ باقاعدہ رجسٹروں اور قاعدوں سے تقسیم ہوتا تھا۔ برعکس اس کے ہمارے ہاں نواب صاحب کے عطیے اور منشی صاحب کی نذریں کام خراب کر دیتی تھیں۔

(۲) بکسر کی لڑائی ۱۷۶۴ء:-

(الف) میر جعفر بنگال، بہار اور اڑیسہ کا نواب کیا بنا، اُس کی وساطت سے انگریز تمام علاقوں کے حاکم بن گئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا نام تمام ہندوستان میں مشہور ہو گیا۔ تخت دہلی کو خدشہ پیدا ہوا۔ لیکن وہاں خود دربار کی سازشیں ہی ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔ ۱۷۵۹ء میں شاہ دہلی عالمگیر ثانی انہیں سازشوں کے سلسلہ میں قتل کر دیا گیا۔ اس کا لڑکا جلال الدین عالی گوہر جس نے بعد میں شاہ عالم ثانی کے نام سے مشہور ہوا تھا، شجاع الدولہ نواب اودھ کی مدد سے شاہ دہلی کا لقب اختیار کر کے صوبہ بہار پر حملہ آور ہوا۔ پٹنہ کا محاصرہ کیا گیا لیکن کلائیو نے باسانی حملہ آوروں کو واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ وجہ وہی ارادی اور سامانی کمزوری تھی۔ جس کی تصریح اوپر ہو چکی ہے۔ یوں فرنگی شاہ دہلی کو بھی شکست دینے میں کامیاب ہو گیا۔

(ب) ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں کو بنگال میں عیش تھے۔ حاکم کے حاکم تھے اور پھر میر جعفر کے نواب ہونے کے باعث خود حکومت کی ذمہ داری سے آزاد ہو کر تجارت کرتے تھے۔ رشوتیں اور غرض مندوں کے تحائف الگ تھے۔ یہی زمانہ ہے جب کمپنی کے ادنیٰ کلرک بھی واپس انگلستان پہنچے تو "نباب" کے ٹھاٹھ سے رہنے لگے۔ غلام حبشی بچے سفید اچکن میں سنہری بٹن لگا کر ان کی بگھی کے پیچھے کھڑے ہوتے تھے۔ لونڈیاں اُن کی لیڈیوں کے سائے کے دامن

اٹھائے پھرتی تھیں۔ لندن کے کوچہ و بازار اس مشرقی شان و شوکت سے دنگ تھے۔ کئی "نباب" تو اُجڑے ہوئے حلقہ ہائے انتخاب سے ووٹ خرید کر پارلیمنٹ کے ممبر بھی بن گئے۔

ان بداعمالیوں سے خود کمپنی کی مالی حالت خراب ہوگئی تو میر جعفر کو ہٹا کر اُس کے داماد میر قاسم کو نواب مقرر کیا گیا۔ اُس نے کمپنی کے ملازمین کی چیرہ دستیوں سے تنگ آ کر اپنا دارالحکومت مونگھیر تبدیل کر لیا اور تمام تاجروں پر سے ٹیکس ہٹا کر انگریز تاجروں کے برابر کر دیا۔ انگریزوں نے پٹنہ پر حملہ کر دیا لیکن میر قاسم نے انگریزوں کو شکست دی۔ آخر انگریزوں نے پھر میر جعفر کو نواب بنا دیا۔

(ج) میر قاسم بھاگ کر نواب اودھ شجاع الدولہ کے پاس پہنچا۔ شاہ عالم ثانی شاہ دہلی بھی وہاں موجود تھے۔ تینوں نے مل کر ۱۷۶۴ء میں بنگال پر حملہ کیا۔ انگریزوں کی طرف سے میجر منرو نے ان سب کو بکسر کے مقام پر شکست دی۔ عہد نامہ الٰہ آباد کی رُو سے شاہ عالم ثانی نے بنگال کی دیوانی عملداری کمپنی کے سپرد کر دی اور چھبیس لاکھ روپیہ سالانہ برائے نام باج اور دراصل پنشن حاصل کر کے انگریزوں کی پناہ میں آ گیا۔

III جنگِ میسور:۔

(۱) پہلی لڑائی ۱۷۶۷ء سے لے کر ۱۷۶۹ء تک:۔

حیدر علی نے اپنی خداداد ذہانت اور ہمت سے میسور میں سلطنتِ خداداد قائم کر لی تھی۔ مرہٹوں کو یہ نئی اسلامی سلطنت طبعاً کھٹکتی تھی۔ نظام دکن کو بھی اس سے حسد تھا۔ کرناٹک میں انگریزوں کے پروردہ نواب محمد علی کو بھی اس سے چشمک تھی۔ انگریز خود حیدر علی سے بدگمان تھے کیونکہ تمام مُلکی طاقتوں میں یہی ایک ایسی طاقت تھی جس میں ایمانی طور پر فرنگی کے نظام سے علیحدگی تھی۔ ایک جدا نظامِ حکومت تھا، ایک جدا تصورِ تمدن تھا، ایک جدا شریعت اور قانون تھا۔ یہ تمام آثار ابتدائی حالت میں تھے لیکن انگریز ایسی علامتیں شناخت کرنے میں غافل نہیں تھا۔ تختِ مغلیہ سے اُنہیں ڈر نہ تھا وہ تو خود بوسیدہ ہو کر گل رہا تھا ہندوستانی ریاستوں کے نواب اور راجے کنویں کے مینڈک تھے۔ جب دل چاہا شکار کر لیں گے۔ مرہٹوں سے بھی خوف نہ تھا، گو اُن کا نظامِ حکومت جدا تھا لیکن ضابطۂ حیات ذات پات کی اُلجھنوں میں اُلجھا ہوا تھا۔ پھر ہندوستان سے باہر اُنہیں جانتا کون تھا۔ لیکن ایک سلطنتِ خداداد تھی جو میسور میں بیٹھی بیٹھی دایاں بازو کابل میں شاہ زمان اور ایران تک بڑھا سکتی تھی تو بایاں بازو خلافتِ تُرکیہ تک پہنچا سکتی تھی۔ پانچ وقت

اذان دینے والوں کی برادری اٹھارھویں صدی کا نصف حصہ گزر جانے کے بعد گو زوال پذیر تھی لیکن فرنگی کا دل ہلا دینے کو خاصی خوفناک تھی۔ اس پر جب حیدر علی نے بحری قوت بھی پیدا کرنا شروع کر دی اور فرانسیسیوں سے بھی تعلقات قائم کر لئے تو گویا غضب ہو گیا۔ زندہ تمدن اور سیاست کی نشانی یہ ہے کہ وہ مدِ مقابل ضابطۂ حیات کا وجود کبھی خاموشی سے برداشت نہیں کرتے۔

فرنگی نے فی الفور مرہٹوں اور نظام دکن کی مدد سے حیدر علی کے خلاف ایک اتحاد قائم کیا۔ حیدر علی نے اپنی خداداد ذہانت سے اس اتحاد کو توڑا تو سہی اور اپنی زندگی میں وہ کامیاب بھی رہا لیکن تاریخ فیصلہ کرے گی کہ غلط رُخ سے توڑا۔ اسی لئے کامیابی عارضی تھی۔ اگر ذہانتِ طبع اور ہمت، اصولِ تدبر و سیاست بھی درست اختیار کرتے تو آج ہندوستان پر فرنگی کے بجائے کوئی اور حکمران ہوتا۔

حیدر علی نے دشمنوں سے نپٹنے میں ہماری مذکورہ بالا ترتیب مدِنظر نہ رکھی جس کی رُو سے پہلے خانگی دشمن نواب اور شریعت فروش سے نپٹنا چاہیے تھا پھر فرنگی یا پیچھے برہمن سے اُلجھنے کا موقع ہو سکتا تھا۔ برعکس اس کے حیدر علی اور اس کے بیٹے ٹیپو دونوں کو اول غیر مُلکی فرنگی کا خاتمہ کرنے کا خبط تھا۔ نواب دکن کو وہ دینی بھائی تصور کر کے دشمنوں کی فہرست میں سب سے آخری جگہ دیتے تھے اور مرہٹوں کو مُلکی اور وطنی بھائی قرار دے کر دشمنی کی فہرست میں دوسرا نمبر دیتے تھے۔ اوّل درجہ فرنگی کا تھا۔ یہ ترتیب بالکل غلط تھی کیونکہ خانگی دشمن اور مارِ آستین نواب سے نپٹے بغیر پیچھے برہمن اور فرنگی سے چھٹکارا ناممکن تھا۔ یہ ویسی ہی غلطی ہے جیسی غلطی کی آج کل مُسلم لیگ کانگرس پر یونینسٹوں کو ترجیح دے کر یا گورنر پنجاب سے بگاڑ کر مرتکب ہوتی ہے۔

نظام دکن کو اس نے اسلامی غیرت دلا کر انگریزوں سے توڑ کر اپنے ساتھ ملا لیا۔

(الف) باوجود سیاسی جوڑ توڑ میں حیدر علی کی اس جیت کے انگریزوں کی فوجی برتری جس کی تفصیل اوپر درج ہو چکی ہے اُن کے کام آئی۔ کرنل سمتھ نے حیدر علی اور نظام کی فوجوں کو چنگامہ اور ترینو کے مقامات پر شکست دی۔ یہ رنگ دیکھتے ہی نظام دکن نوابی کی منافقانہ روایات کے ماتحت انگریزوں سے مل گیا۔ یوں حیدر علی کا وہ نظریہ غلط ثابت ہوا کہ نواب دینی رشتہ سے فرنگی اور بنیا برہمن کے مقابلہ میں مسلمان کے زیادہ قریب ہے۔

(ب) حیدر علی کا نظریہ تو غلط ثابت ہو گیا لیکن اُس کی ہمت درست ثابت ہوئی اور ذہانتِ طبع کام آئی۔ اس کی سوار فوج انگریزوں کے مقابلہ میں زیادہ تھی۔ نیز اُس کا رسد کا نظام بھی انگریزوں سے بہتر تھا۔ اس لئے پہلے تو اُس نے انگریزی افواج کا مقابلہ کرنے کے بجائے

کرناٹک کا علاقہ جا بجا ویران کر کے انہیں زچ کیا۔ پھر موقع پاتے ہی ۱۷۶۹ء میں عین مدراس کی دیواروں تلے آنکلا۔ صلح نامہ مدراس کی رو سے فریقین نے ایک دوسرے کے فتح کردہ علاقے واپس کر دیئے اور عہد کیا کہ دونوں میں سے کسی پر اگر کوئی تیسری طاقت حملہ کرے تو یہ دونوں ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

(۲) دوسری لڑائی ۱۷۸۰ء سے لے کر ۱۷۸۴ء تک:۔

دراصل نوابوں کے منافق طبقہ کے علاوہ حیدر علی کو ایک اور دقت بھی درپیش تھی اور یہ دقت آج کل ہندوستان کے مسلمانوں کو درپیش ہے۔ قطع نظر شریعت فروش اور نواب جیسے غداروں اور بغلی گھونسوں کے وہ دقت یہ ہے کہ مسلمان، بنیے، برہمن اور فرنگی سے ہندوستان میں ایک ایسی تکون بن گئی ہے۔ جس میں مسلمان کو بیک وقت ایک ملکی اور ایک غیر ملکی دشمن سے مقابلہ ہے۔ شروع سے ہماری کوشش رہی ہے کہ ہم ایک کے ساتھ مل کر دوسرے کو فنا کریں لیکن ہمیشہ عین آخری مرحلے پر یہ دونوں کوئی ساز باز کر لیتے ہیں، جس سے ہماری تجاویز دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔

حیدر علی نے صلح مدراس کے موقع پر ۱۷۶۹ء میں انگریزوں کے ساتھ دفاعی معاہدہ کر کے کوشش کی تھی کہ مرہٹوں کے خلاف ایک زبردست حلیف کی حمایت حاصل کر لے لیکن تھوڑا عرصہ بعد جب مرہٹوں نے واقعی حیدر علی پر حملہ کیا تو انگریز ایک بہانہ سے معاہدہ پورا کرنے اور مرہٹوں کے خلاف حیدر علی کی امداد کرنے سے کنی کترا گئے۔

اس پر حیدر علی نے تکون کے دوسرے سرے سے مل کر تیسرے سرے کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ یعنی مرہٹوں سے معاہدہ کر کے انگریزوں کو شکست دینی چاہی لیکن وقت پڑنے پر وہ بھی قلانچ مار کر فرار ہو گئے۔

دراصل اس مثلث سے میدان جنگ میں نپٹنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ پہلے ایک سے مل کر دوسرے کو زچ کیا جائے۔ اس سارے دوران میں یہ بات ذہن میں رکھی جائے کہ آخری مرحلے تک ان دونوں میں سے کوئی ہمارا پورا ساتھ نہیں دے گا۔ پھر قبل اس کے کہ دونوں مل پائیں ہم خود دوسرے سے مل کر پہلے کو ختم کر دیں۔ واضح رہے کہ یہ چال صرف ایک مرتبہ چلی جا سکتی ہے اگر یہ ایک دفعہ ناکام رہے تو پھر یہ دونوں ہمیشہ کو ہماری اس وقت کی قیادت کے خلاف چوکنا ہو جائیں گے جس کا واحد علاج یہ ہوگا کہ ہم کوئی دوسری قیادت تیار کر رکھیں جس سے یہ پھر مطمئن ہو جائیں۔ دوسرے اس تجویز کی ساری کامیابی کا دارومدار اس پر ہے کہ ہم پہلے کا

ساتھ چھوڑ کر دوسرے کے ساتھ عین اس وقت ملیں جب دوسرا زیادہ سے زیادہ کمزور اور پہلا کم سے کم طاقتور ہو چکا ہو۔

بہر کیف میسور کی دوسری لڑائی میں بھی گو حیدر علی کا اصولی نظریہ مندرجہ بالا تجویز کے مطابق اتنا صحیح نہ تھا جتنا ہونا چاہیے تھا یا ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کی ہمت اور ذہانت پھر کام دے گئی۔

(الف) تفصیل اس کی یہ ہے کہ ۱۷۷۹ء میں انگلستان اور فرانس کے مابین جنگ چھڑی تو انگریزوں نے ہندوستان کے تمام فرانسیسی مقبوضات پر قبضہ کر لیا۔ ان فرانسیسی علاقوں میں ماہی کی بندرگاہ بھی شامل تھی۔ حیدر علی کا دعویٰ تھا کہ ماہی کی بندرگاہ ساحل کے جس ٹکڑے پر واقع تھی اس میں بغیر حیدر علی سے استصواب کئے دخل نہ دیا جا سکتا تھا۔ انگریزوں نے اس کی بات نہ مانی۔ اس پر حیدر علی نے قریباً تمام مرہٹہ سرداروں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ نظام دکن کو بھی شریک کیا اور انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور اسی ہزار سپاہی کی ایک فوج لے کر تمام کرناٹک ویران کر ڈالا۔ کرنل بیلی اس کے مقابلہ کو گئے تو انہیں ہتھیار ڈالنے پڑے۔ فاتح بکسر میجر منرو نے بھی اس میں خیر سمجھی کہ اپنی توپیں کنجیوارام کے قریب ایک تالاب میں پھینک دیں اور خود مدراس بھاگ گئے۔

(ب) اس وقت وارن ہسٹنگز گورنر جنرل تھا اس نے منافق نواب نظام حیدر آباد کو پھر حیدر علی سے ورغلا کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ مرہٹوں سے بھی بات چیت شروع کی اور سر آئر کوٹ فاتح وندواش کو حیدر علی کے خلاف بھیجا۔ سر آئر کوٹ نے حیدر علی کو پورٹونووو، پلی لور اور سولن گڑھ کے مقامات پر ۱۷۸۱ء میں شکستیں دیں۔ ۱۷۸۲ء میں سلبئی کے معاہدہ سے مرہٹوں نے حیدر علی کو چھوڑ کر انگریزوں سے علیحدہ صلح کر لی۔

(ج) حیدر علی نے نظام اور مرہٹوں کے ساتھ چھوڑنے سے ہمت نہ چھوڑی اور اپنے لڑکے ٹیپو کو تنجور کی طرف احاطہ بمبئی سے آنے والی افواج تھامنے کے لئے روانہ کیا۔ ٹیپو کو یہاں شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔ دو ہزار انگریز سپاہ تباہ و برباد کر دی گئی۔ اسی وقت فرانسیسی بحری بیڑا امیر البحر صفران کے ماتحت بحر ہند میں آ پہنچا تو اس سے حیدر علی کے حوصلے اور بھی بلند ہو گئے۔

(د) اسی دوران میں حیدر علی فوت ہو گئے۔ ٹیپو نے بڑی قابلیت سے باپ کی موت کے بعد جنگ کو سنبھالا۔ آخر یورپ میں فرانس اور انگریزوں کے مابین صلح ہو گئی تو ۱۷۸۴ء میں گورنر جنرل وارن ہسٹنگز کی مرضی کے خلاف حکومت مدراس نے اس عہد نامہ منگلور کی رو سے سلطان ٹیپو سے صلح کر لی۔ جانبین نے ایک دوسرے کے مفتوحہ علاقے واپس کر دیئے۔

(۳) تیسری لڑائی ۱۷۹۰ء سے ۱۷۹۲ء تک:۔

حیدر علی کی موت کے بعد اب سلطان ٹیپو تین دشمنوں میں گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف تو حیدر آباد دکن کا نواب اس کے خون کا پیاسا تھا دوسری طرف مرہٹے اس کے بدخواہ تھے اور تیسری طرف فرنگی اس کا جانی دشمن بن چکا تھا۔ ان دشمنوں سے بچنے کے لئے ٹیپو نے کیا تدابیر اختیار کیں؟ نظام دکن اور نواب کرناٹک کو تو اس نے ہاتھ نہ لگایا۔ مرہٹوں کو بھی وہ نہ چھیڑنا چاہتا تھا۔ فرنگی سے حال ہی میں جھڑپ ہو چکی تھی۔ دم لینے کو موقع ملا تھا۔ ٹیپو نے سلطان ترکی اور شاہ ایران اور شاہ زمان بادشاہ کابل کے پاس سفارتیں بھیجیں لیکن گھر کی دیوار سے لگے ہوئے دشمنوں کا کچھ نہ کیا۔ فرانس کی امداد اس کی واحد امید تھی۔

حیدر علی کی جن اصولی غلطیوں کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں وہ اس کی زندگی میں تو اس کی ہمت اور ذہانت سے کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں لیکن اب جب نوجوان ٹیپو انہیں کے گورکھ دھندے میں پھنس کر نواب اور نیا برامن سے پہلے فرنگی کو ختم کرنے کے خبط میں باہر نکلا تو مہلک نتائج برآمد ہوئے۔

(الف) ۱۷۸۹ء میں ٹیپو نے انگریزوں کی زیر پناہ ہندو ریاست ٹراونکور پر حملہ کر دیا شائد اس کا خیال تھا کہ یوں وہ اپنی طاقت میں اضافہ کر سکے گا۔ گورنر مدراس کو اس نے پہلے ہی رشوت دے کر خاموش رہنے کا وعدہ لے رکھا تھا۔ گورنر مدراس تو خاموش رہا اور ٹیپو نے ٹراونکور میں بڑی کامیابی بھی حاصل کی لیکن لارڈ کارنوالس نے جو اس وقت گورنر جنرل تھا نظام دکن اور مرہٹوں کے ساتھ ٹیپو کے خلاف اتحاد ثلاثہ قائم کیا اور خود ٹیپو کے خلاف افواج کی کمان کرنے جنوبی ہند میں جا پہنچا۔ ٹیپو کو اریکیری کے مقام پر شکست ہوئی اور بنگلور پر کارنوالس کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد رسد کی کمی کے باعث اتحاد ثلاثہ کی افواج کو واپس بنگلور لوٹنا پڑا۔

(ب) بنگلور میں کارنوالس نے جلد ہی افواج کو درست کر لیا اور سرنگا پٹم میں ٹیپو کو محصور کر لیا۔ صلحنامہ سرنگا پٹم کی رو سے ٹیپو نے اپنی نصف سلطنت اتحاد ثلاثہ کے حوالہ کر دی جو تینوں نے آپس میں برابر تقسیم کر لی۔ تین کروڑ روپیہ تاوان جنگ ادا کیا اور اپنے دو بیٹے یرغمال کے طور پر ان کے حوالے کر دیے۔

(۴) چوتھی لڑائی ۱۷۹۹ء:۔

ٹیپو زخم خوردہ ہو کر اب صرف فرانس سے امداد کی توقع رکھتا تھا۔ جب نپولین بونا پارٹ مصر میں آیا تو ٹیپو نے اس سے گفت و شنید کی۔ انگریز اس سے بے خبر نہ تھے۔ لارڈ ولزلی نے

جواب گورنر جنرل تھا ٹیپو سے جواب طلبی کی۔ ٹیپو نے انگریزوں کے سامنے جوابدہ ہونے سے انکار کیا تو انگریزوں نے اعلان جنگ کر دیا۔ ۱۷۹۸ء میں نظام دکن پہلا ہندوستانی تاجدار تھا جس نے سبسڈیری سسٹم میں شامل ہو کر انگریزی سیادت قبول کر لی۔

(الف) مدراس سے ایک فوج جس میں نظام دکن کے عساکر بھی شامل تھے جنرل ہیرث کے ماتحت آگے بڑھی۔ ٹیپو نے ملاویلی کے قریب مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔

(ب) بمبئی سے ایک فوج جنرل سٹوگرٹ کے ماتحت آگے بڑھی۔ ٹیپو نے سداسیر کے قریب مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔

(ج) ٹیپو اب اپنے دارالحکومت سرنگا پٹم میں محصور ہو گیا۔ دونوں انگریزی فوجیں یہاں آ کر مل گئیں۔ ٹیپو داد شجاعت دیتا ہوا شہید ہوا۔ میسور کے قدیم ہندو راجا کی اولاد کو گدی پر بٹھا دیا تھا۔ یوں سلطنت خداداد ۱۷۹۹ء میں ختم ہو گئی۔

IV مرہٹوں سے جنگ:۔

(۱) پہلی لڑائی ۱۷۷۵ء سے لے کر ۱۷۸۲ء تک:۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی تیسری لڑائی میں احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کا کچومر نکال کر ان کے تخت دہلی پر قبضہ کرنے کے تمام منصوبے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیئے۔ تاہم ہندوستان کے مختلف حصوں میں مرہٹہ سرداروں کی بجائے خود قوت باقی تھی۔ پیشوا گو اب ایک سیاسی مرکز کی حیثیت میں ان سب سرداروں کو اپنی اطاعت پر مجبور نہ کر سکتا تھا لیکن اس کا صدر مقام پونا مذہبی مرکز اور بھائی چارہ کے بندھن کے طور پر اب بھی ایک اثر رکھتا تھا۔ چوتھا پیشوا مادھو راؤ مر گیا تو اس کا چھوٹا بھائی نارائن راؤ گدی پر بیٹھا۔ نارائن راؤ کو ایک سال بھی گدی پر بیٹھے نہ ہوا تھا کہ مادھو راؤ کے بھائی اور نارائن راؤ کے چچا رگھوبا کے حمائتیوں نے نارائن راؤ کو قتل کر ڈالا۔ اب رگھوبا اپنے پیشوا بننے کے لئے میدان خالی سمجھتا تھا لیکن اس مرحلہ پر نانا فرنویس نے جو اپنے وقت کا لائق ترین مرہٹہ لیڈر تھا مادھو راؤ نرائن کو پیشوا بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ مادھو راؤ نرائن، نرائن راؤ کا لڑکا تھا اور نارائن راؤ کے قتل کے بعد پیدا ہوا تھا۔

رگھوبا نے جب یوں اپنی امیدوں کا خون ہوتے دیکھا تو بمبئی کی انگریزی گورنمنٹ کے ساتھ عہد نامہ سورت کی رو سے معاہدہ کیا کہ تم مجھے مادھو راؤ نرائن کے خلاف پیشوا بننے میں

مدد دو۔ میں تمہیں اس کے عوض سلہٹ اور بسین کے علاقے نذر کرتا ہوں۔

۱۷۷۳ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ایک ریگولیٹنگ ایکٹ پاس کیا تھا جس کی رُو سے مدراس اور بمبئی کی گورنمنٹیں اب کلکتہ کی کونسل اور گورنر جنرل کے ماتحت آ گئی تھیں۔

اپنے اس اختیار کا استعمال کرتے ہوئے کلکتہ کی اعلیٰ کونسل نے بمبئی گورنمنٹ کا طے کردہ عہد نامہ سورت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اُس کی جگہ خود پورن دھر کے عہد نامہ کی رُو سے نانا فرنویس کے ساتھ اس شرط پر صلح کر لی کہ تم ہمارے پاس سلہٹ رہنے دو جو رگھوبا نے ہمیں تمہارے خلاف مدد حاصل کرنے کی خاطر دیا تھا۔ ہم بسین کا دعویٰ ترک کرتے ہیں اور رگھوبا کی مدد بھی نہیں کریں گے۔

عہد نامہ پورن دھر طے ہوئے کچھ دیر بھی نہ ہوئی تھی کہ لندن میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں نے عہد نامہ سورت قبول کرنے اور عہد نامہ پورن دھر نا منظور کرنے کی ہدایت بھیج دیں۔

(الف) اب رگھوبا کے ساتھ رشتہ تازہ کر کے ایک انگریزی فوج پونا کی طرف بڑھی لیکن نانا فرنویس نے اس فوج کو چاروں طرف سے گھیر کر اس کا ناطقہ بند کر دیا۔ اس فوج نے عہد نامہ ورگاؤں کی رُو سے سلہٹ اور بسین دونوں علاقوں سے دست برداری کا اعلان کیا اور وعدہ کیا کہ رگھوبا بھی نانا فرنویس کے حوالے کر دیا جائے گا۔

(ب) کمپنی کے ڈائریکٹروں نے عہد نامہ ورگاؤں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ بنگال سے کرنیل گاڈرڈ کو فوج دے کر بھیجا گیا۔ اس نے احمد آباد پر قبضہ کر لیا۔ کپتان پاپہم نے گوالیار کے قلعہ پر حملہ کیا۔

(ج) ۱۷۷۹ء میں حیدر علی نے انگریزوں کے ماہی کی بندرگاہ پر قبضہ کرنے سے بگڑ کر تمام مرہٹہ سرداروں اور نظام دکن کو اپنے ساتھ ملا کر انگریزوں کے خلاف ایک اتحادِ عظیم کھڑا کر دیا۔ اب تو انگریز گھبرا گئے۔ وارن ہسٹنگز نے جو اس وقت گورنر جنرل تھا مادھو جی سیندھیا کی مدد سے مرہٹوں کے ساتھ علیحدہ صلح کی سلسلہ جنبانی کی اور آخر عہد نامہ سلبئی کی رُو سے ۱۷۸۲ء میں انگریزوں اور مرہٹوں کے درمیان صلح ہو گئی۔ اس عہد نامہ کی موٹی موٹی شرائط یہ تھیں۔ انگریز سلہٹ پر اپنا قبضہ برقرار رکھیں گے۔ رگھوبا پیشوائی کا دعویٰ ترک کر کے مرہٹوں سے تین لاکھ روپیہ سالانہ کی پنشن پر قناعت کرے گا۔ مرہٹہ علاقوں میں سوائے پرتگیزوں کے اور کوئی یوروپین قوم رہائش نہ رکھ سکے گی۔

(۲) دوسری لڑائی ۱۸۰۳ء سے لے کر ۱۸۰۵ء تک:۔

مرہٹوں کی پہلی لڑائی کے حالات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ انگریزوں کی ہندوستانی حکمرانوں پر عام برتری کے علاوہ جس کا ذکر اوپر کسی دوسری جگہ ہو چکا ہے دراصل یہ مرہٹوں کے اپنے خانگی جھگڑے تھے جن کے باعث انگریزوں کو ان کے داخلی تنازعوں میں دخل دینے کا موقع ملا اور اسی چھین جھپٹ میں سلہٹ کا علاقہ اُن کے قبضہ میں آ گیا۔

مرہٹوں کی دوسری جنگوں اور پھر سکھوں کی جنگوں میں ہم یہی دیکھیں گے کہ ایمانی اور ارادی یکسوئی کے فقدان اور کسی ہمہ گیر ضابطۂ حیات سے وابستہ نہ ہونے کے باعث خود بخود داخلی انتشار پیدا ہو جاتا ہے اور بہتر ارادی یکجہتی اور زیادہ منظم ضابطۂ حیات رکھنے والا فرنگی، ہندو اور سکھ طاقتوں پر غالب آ جاتا ہے۔ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ اصولاً شائد فرنگی کا ضابطۂ حیات ہندو اور سکھ کی نسبت بھی زیادہ وحشیانہ اور نامکمل تھا۔

نانا فرنویس کی موت کے بعد دولت راؤ سیندھیا اور جسونت راؤ ہلکر کی باہمی رنجشیں مٹانے والا کوئی نہ رہا۔ اس وقت باجی راؤ ثانی پیشوا کی گدی پر تھا۔ پیشوا نے سیندھیا کا ساتھ دیا۔ ۱۸۰۲ء میں ہلکر نے پونا کے قریب سیندھیا اور پیشوا دونوں کے لشکروں کو ایسی شکست دی کہ پیشوا اپنے دارالحکومت پونا سے بھاگ کر مدد کی تلاش میں انگریزوں کے پاس پہنچا۔ اس وقت لارڈ ولزلی گورنر جنرل تھا اور اُس نے سبسڈیری سسٹم کے نام سے ہندوستان میں ایک تازہ حکمت عملی اختیار کی تھی۔ اس حکمت عملی کی رُو سے جو ہندوستانی حکمران اس نظام میں شامل ہوتا اُسے اوّل یہ اقرار کرنا پڑتا کہ انگریز ہندوستان میں حاکم اعلیٰ کا منصب رکھتے ہیں۔ دوسرے اُسے اپنے آپ اور اپنی ریاست کو انگریزوں کی حفاظت میں دینا پڑتا تھا۔ تیسرے کسی دوسرے ملکی یا غیر ملکی سلطنت یا ریاست سے کوئی معاہدہ کرنے سے قبل وہ انگریزوں سے اجازت لینے کا اقرار کرتا تھا۔ چوتھے اُسے ایک مقررہ رقم انگریزی فوج کے اخراجات کے لئے ادا کرنی پڑتی تھی۔ پانچویں اُسے ایک انگریز ریذیڈنٹ اپنے پاس رکھنا پڑتا تھا کہ اس کی نگرانی کرتا رہے اور اُس کو مشورہ دیتا رہے۔ چھٹے ان تمام شرائط کے بدلے انگریز اس کی جان و مال اور ریاست کی حفاظت کا ذمہ لیتے تھے۔

اب حضرت پیشوا انگریز سے مدد لینے پہنچے تو ۱۸۰۲ء میں عہد نامہ بسین کی رُو سے انہیں بھی اس سبسڈیری سسٹم میں شامل کر لیا گیا۔

پیشوا اور انگریزوں کے اس اتحاد سے مرہٹہ سردار سیندھیا اور بھونسلہ نہایت ناراض

ہوئے وہ اس میں مرہٹہ قوم کی جنگ سمجھتے تھے۔ قبل اس کے کہ مرہٹے کچھ کر سکتے انگریزوں نے اُن پر حملہ کر دیا اور یوں دوسری مرہٹہ جنگ شروع ہوئی۔

(الف) لارڈ ولزلی کا چھوٹا بھائی آرتھر ولزلی پیشوا کو اپنی حفاظت میں پونا چھوڑ آیا۔

(ب) دکن کی انگریز فوج کی کمان آرتھر ولزلی کے سپرد کی گئی اس نے احمد نگر فتح کر لیا۔ ایسے مقام پر سیندھیا اور بھونسلے کی متحدہ افواج کو شکست دی۔ دو مہینہ بعد بھونسلہ نے اراگاؤں کے مقام پر پھر آرتھر کا مقابلہ کیا اور شکست کھائی۔ ان شکستوں نے بھونسلہ کی ہمت توڑ دی اور اُس نے دیوگاؤں کے عہد نامہ کی رُو سے کٹک اور برار کے علاقے انگریزوں کے حوالے کر دیئے۔

(ج) شمالی انگریزی افواج کی کمان جنرل لیک کے سپرد کی گئی۔ اس نے علیگڑھ فتح کر لیا۔ پھر ۱۸۰۳ء میں دِلّی کی دیواروں تلے سیندھیا کو زبردست شکست دی۔ شاہ عالم ثانی شاہ دہلی انگریزوں کے ہاتھ آ گیا۔ لاسواری کے مقام پر سیندھیا کو پھر شکست دی۔

ان شکستوں نے سیندھیا کی کمر توڑ دی اور اُس نے بھی عہد نامہ سرجی ارجن گاؤں کی رُو سے سبسڈیری سسٹم میں شمولیت قبول کر لی۔ بھڑاچ کی بندرگاہ، احمد نگر کا قلعہ اور گنگا جمنا کا درمیانی علاقہ سیندھیا نے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔

(د) جسونت راؤ ہلکر اب واحد مرہٹہ سردار تھا جو ابھی تک خود مختار تھا۔ انگریزوں نے اسے بھی مطیع کرنے کی ٹھانی۔ ہلکر نے انگریزوں کے حلیف راجپوتوں کا علاقہ فتح کر لیا۔ کرنل مونسن ہلکر کے مقابلہ کو بڑھا۔ درّہ مکندرہ کے پاس ہلکر نے کرنل مونسن کو سخت شکست دی اور تین بٹالین انگریزی فوج تباہ کر ڈالی۔

اب جرنیل لیک آیا اور اُس نے فرخ آباد اور ڈگ کے مقامات پر ہلکر کو شکستیں دیں لیکن جب جرنیل لیک نے بھرت پور کا قلعہ فتح کرنا چاہا تو اسے بار بار ناکامی ہوئی۔ آخر یہاں کے راجہ نے تین مہینہ کی جنگ کے بعد انگریزوں سے صلح کر لی اور بیس لاکھ روپیہ نذر کر کے اُنھیں رخصت کیا۔

اسی اثناء میں لارڈ ولزلی کو واپس انگلستان بلا لیا گیا۔ سر جارج بارلو گورنر جنرل بن کر آیا تو اس نے ہلکر سے صلح کر لی۔

(۳) تیسری لڑائی ۱۸۱۷ء سے لے کر ۱۸۱۹ء تک:۔

انگریز کسی کے مذہبی، سیاسی، تمدنی اُصولوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتا لیکن اگر کہیں اُس کے بنیادی ارادوں کے بہاؤ کے خلاف کوئی ایمانی یکجہتی اور یکسوئی پرورش پا رہی ہو یا کچھ جسمانی حقائق اُس کے خلاف جمع ہو رہے ہوں تو ایسی باتیں سونگھ لینے میں اُس کا دماغ بلا کا تیز ہے۔

دوسری مرہٹہ جنگ کے بعد باجی راؤ ثانی نے دیکھا کہ انگریزوں نے عہد نامہ بسین کی رُو سے اُسے سیندھیا سے تو بچا دیا لیکن اس کی قیمت یوں ادا کرنی پڑی کہ ایک طرف تو اکثر و بیشتر مرہٹہ سردار انگریزوں کی اطاعت پر مجبور ہو گئے۔ وسیع مرہٹہ علاقے انگریزوں کے قبضہ میں چلے گئے۔ دوسری طرف خود پیشوا بھی انگریزوں کی نگرانی میں تھا۔ طبعاً وہ اس صورتِ حالات سے غیر مطمئن اور بے چین تھا۔ ادھر انگریز بھی جانتے تھے کہ پیشوا ایک مرکز ہے جو کبھی مرہٹہ سرداروں کو انگریزوں سے منحرف کر سکتا ہے۔ ۱۸۱۴ء سے لے کر ۱۸۱۶ء تک انگریزوں کی نیپال سے جنگ ہوئی تو پیشوا انگریزوں کے خلاف تجویزیں کرتا رہا۔ اس نے مرہٹہ سرداروں سے بھی ساز باز شروع کی۔ انگریز بھی موقع کی تاک میں تھے۔

۱۸۱۵ء میں حاکم بڑودہ گائیکواڑ (ایک مرہٹہ سردار جواب انگریزوں کی پناہ میں تھا) اور پیشوا کے مابین خراج کی رقم کا کچھ جھگڑا چکانے کے لئے گائیکواڑ کی جانب سے اس کا برہمن سفیر پیشوا کے پاس پونا آیا۔ یہاں پیشوا کے وزیر تریمبک جی کے اشارے سے اس برہمن سفیر کو قتل کر دیا گیا۔

انگریزوں نے اپنے زیرِ پناہ گائیکواڑ کی جانب سے پیشوا سے مطالبہ کیا کہ تریمبک جی کو اُن کے حوالے کر دیا جائے۔ پیشوا نے چاروناچار ایسا ہی کی۔ لیکن تریمبک جی بھی ایک اُستاد تھا اور دراصل پیشوا سے انگریزوں کے خلاف کاروائیاں کروانے میں وہی پیش پیش تھا۔ اب تریمبک جی انگریزوں کی قید سے بھاگ نکلا۔ پیشوا نے تریمبک جی سے نامہ و پیام اور مالی امداد بھیجنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

اس پر پونا میں انگریزوں کے ریذیڈنٹ نے پیشوا کو ۱۸۱۷ء میں ایک نیا عہد نامۂ پونا قبول کرنے پر مجبور کیا۔ اس سے پیشوا کے اختیارات اور بھی کم کر دیئے گئے اور اس سے اعلان کرایا گیا کہ وہ مرہٹوں کی پیشوائی اور سرداری کا دعوٰی ترک کرتا ہے۔

(الف) پیشوا نے اُس وقت عالمِ مجبوری میں عہد نامۂ پونا پر دستخط تو کر دیئے لیکن ساتھ ہی جنگ کی تیاری بھی شروع کر دی۔ پیشوا نے ۱۸۱۷ء میں کرکی کے مقام پر انگریزی فوج

حملہ کیا لیکن شکست کھائی اور خانماں برباد ہو کر جنوب کی طرف چلا گیا۔

(ب) آپا صاحب بھونسلہ نے سیتا بالدی کے مقام پر برطانوی ریذیڈنسی پر حملہ کیا لیکن شکست کھائی۔ قید ہوا۔ بھاگ نکلا اور کہیں گمنام مر گیا۔

(ج) اندور میں جسونت راؤ ہلکر کی بیوہ تلسی بائی انگریزوں کی حامی تھی۔ فوجی سرداروں نے اُسے قتل کر کے مہدی پور پر انگریزی فوج کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی اور ہلکر کا نابالغ لڑکا جو اب اندور کا راجہ تھا، انگریزوں کے ہاتھ آ گیا۔

(د) آشتی اور کوری گاؤں کے مقامات پر پیشوا کو شکستیں ہوئیں۔ آخر اس نے اپنے تئیں انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ جنہوں نے اُسے آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ پنشن دے کر کانپور کے قریب بٹھور میں نظر بند کر دیا۔ اس کے اکثر مقبوضات پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا اس طرح مرہٹہ جتھا ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

7 سکھوں سے جنگ:۔

(۱) پہلی لڑائی ۱۸۴۵ء سے لے کر ۱۸۴۶ء تک:۔

۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ مر گیا۔ اس کی موت کے چھ سال بعد تک پنجاب میں طوائف الملوکی کا عالم رہا۔ اس کے لڑکے ایک ایک کر کے مختلف سکھ سرداروں کے ہاتھوں مارے گئے۔ خود سکھ سردار بھی ایک دوسرے کو قتل کرتے رہتے تھے۔ آخر رنجیت سنگھ کا سب سے چھوٹا لڑکا دلیپ سنگھ تخت پر بٹھایا گیا۔ دلیپ سنگھ کی ماں رانی جنداں اس کی محافظ قرار پائی۔ لال سنگھ جو کہ رانی جنداں کا منظورِ نظر تھا وزیرِ اعظم بنا۔ سکھ فوج جو کہ خالصہ کہلاتی تھی اور جس کی تعداد اس وقت ستر ہزار کے لگ بھگ تھی نہایت خود سر ہو رہی تھی۔ لال سنگھ اور رانی جنداں نے باہم مشورہ طے کیا کہ خود سر خالصہ فوج سے نجات حاصل کرنے کی خاطر ان کو انگریزوں سے بھڑا دیا جائے۔ اُن کا خیال تھا کہ اس طرح فوج کی طاقت قابو میں آ جائے گی۔ یہ معلوم نہ تھا کہ انگریز خود بلا کی طرح اُن پر مسلط ہو جائیں گے۔ یوں سکھوں کی پہلی لڑائی شروع ہوئی۔

(الف) دسمبر ۱۸۴۵ء میں خالصہ فوج نے دریائے ستلج جو کہ انگریزوں اور سکھوں کے علاقہ کے درمیان حدِ فاصل تھا عبور کیا ۱۸/ دسمبر ۱۸۴۵ء کو مدکی کے مقام پر مقابلہ ہوا۔ سکھوں کو شکست ہوئی۔ تین دن بعد فیروز شاہ پر جنگ ہوئی۔ یہاں بھی سکھوں کو شکست ہوئی۔

(ب) ایک مہینہ بعد سر ہیری سمتھ نے علی وال کے مقام پر سکھوں کو پھر شکست

دی اور انہیں ستلج سے پار واپس لوٹ جانے پر مجبور کر دیا۔

(ج) چند مہینے فیروز پور کے مشرق کی طرف سبراؤں کے مقام پر سکھ جنگ کی تیاری کرتے رہے۔ پھر ۱۰/ فروری ۱۸۴۶ء کو انگریزوں سے اُن کی لڑائی ہوئی۔ یہاں بھی سکھوں نے شکست کھائی۔ عہد نامہ لاہور کی رُو سے ستلج اور بیاس کے درمیان کا علاقہ جسے جالندھر دوآب کے نام پکارا جاتا ہے انگریزوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ انگریزوں کی طرف سے سر ہنری لارنس لاہور میں ریذیڈنٹ مقرر ہوا۔ سکھ فوج کی تعداد 20 ہزار مقرر کر دی گئی۔ دلیپ سنگھ بدستور تخت پر رکھا گیا اور سکھ سرداروں کی ایک کونسل اُس کی نگران مقرر ہوئی۔ انگریزوں کی ایک فوج لاہور میں مقیم رکھی گئی۔ گلاب سنگھ گورنر کشمیر وجموں نے ڈیڑھ کروڑ روپیہ کے عوض کشمیر کی ریاست خریدی اور اس رقم سے دربار لاہور نے انگریزوں کو تاوانِ جنگ ادا کر دیا۔

(۲) دوسری لڑائی ۱۸۴۸ء سے لے کر ۱۸۴۹ء تک:۔

مولراج انگریزوں کی آمد سے پہلے ملتان کا حاکم چلا آ رہا تھا۔ اب اُس نے فرنگی اثر کے ماتحت دربار لاہور کی حالت بدلتی دیکھی تو استعفیٰ دے دیا۔ دربار لاہور میں برطانوی ریذیڈینٹ سر ہنری لارنس کے زیرِ اثر مولراج کا استعفیٰ منظور کر کے ایک سکھ کو اس کی جگہ مقرر کر دیا گیا اور دو انگریز افسران کے ساتھ اُس سکھ کو ملتان روانہ کیا گیا۔

ملتان کی فوج انگریز افسروں کو دیکھ کر بھڑک اُٹھی۔ دونوں انگریز افسروں کو قتل کر دیا گیا۔ دربار لاہور اور انگریزوں کے خلاف بغاوت ہو گئی۔ کئی سکھ سردار جو انگریزوں سے انتقام لینا چاہتے تھے اس بغاوت میں شریک ہو گئے۔

(الف) ہربرٹ ایڈورڈز جو کہ دربار لاہور کا ملازم تھا کچھ افواج لے کر ملتان کی طرف بڑھا۔ مولراج کو دو مقامات پر شکست ہوئی اور آخر وہ ملتان میں قلعہ بند ہو بیٹھا۔

(ب) لاہور سے انگریز ریذیڈنٹ سر ہنری لارنس نے شیر سنگھ کو فوج دے کر مولراج کے خلاف بھیجا لیکن شیر سنگھ مولراج کے ساتھ مل گیا۔ سکھ سرداروں نے امیر دوست محمد خاں والئے کابل کو پشاور نذر کے طور پر پیش کر کے اس کی امداد بھی حاصل کر لی۔ انگریزوں کو مجبوراً ملتان کا محاصرہ اُٹھانا پڑا۔ اس وقت تک تمام مقتدر سکھ سردار انگریزوں کے خلاف ہو چکے تھے۔

(ج) لارڈ گف نے ستر ہزار فوج کے ساتھ چیلیانوالہ کے مقام پر سکھوں کا مقابلہ کیا۔ لیکن سخت شکست اُٹھائی۔

(د) انگریزوں نے ملتان کا قلعہ فتح کرلیا۔ مولراج قید کرلیا گیا۔

(ر) گجرات کے قریب سکھوں نے انگریزوں سے شکست کھائی اور خالصہ فوج نے ہتھیار ڈال دیئے۔ مارچ ۱۸۴۹ء میں پنجاب انگریزی علاقہ میں شامل کرلیا گیا۔ دلیپ سنگھ کو پنشن دے کر لندن ملکہ وکٹوریہ کے دربار میں بھیج دیا گیا۔ پنجاب کی حکومت ہنری لارنس اور اس کے بھائی جان لارنس کے سپرد کردی گئی۔

شخصی تقسیم:۔

اس فصل میں ۱۷۰۷ء سے لے کر ۱۹۰۷ء تک کی تاریخ لکھنا مطلوب نہیں، محض پاکستان کے تاریخی پس منظر کو سمجھنا ہے۔ صرف انگریزوں نے جن پانچ جنگوں سے ہندوستان پر قبضہ کیا اُن کے واقعات کسی قدر تفصیل سے لکھ دیئے گئے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ پتہ چل جائے، فرنگی کا غلبہ کوئی جادو کا شعبدہ یا خدائی معجزہ نہ تھا بلکہ چند گنے چنے اور نپے تلے وجوہات کا نتیجہ ہے۔ خود یہ وجوہات ہمارے ایمانی تزلزل اور ضابطۂ حیات کی لغزشوں کا نتیجہ تھے۔ ہم توحید بھول گئے، وہ آرزو کی توحید، ارادوں کی توحید، ایمان کی توحید اور عمل کی توحید، جس پر ہماری اُمت قائم ہوئی تھی۔ توحید ترک کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری شخصیت پریشان اور ملت منتشر ہوگئی۔ نسل، اقتصاد یا ملک تو ہماری بنائے اجتماع بھی تھے ہی نہیں۔ لے دے کے بنائے وحدت توحید ہی تھی۔ اسے چھوڑا تو اپنے آپ کو چھوڑا۔ اس کے بغیر قرآن مجموعہ اوراق رہ گیا۔ سُنت اعادہ روایات بن گئی۔ بیعت اطاعت رسوم تک محدود ہوگئی اور ہم خود مختون ماتھے پر سجدہ کے نشان اور ٹھوڑیوں کے نیچے لٹکتی ہوئی داڑھیوں سمیت، مسلمان کہلانے والے لوگ رہ گئے، جن کے اندر سے رُوحِ اسلام اور خارج سے شوکتِ اسلام رُخصت ہو چکے ہیں۔ پاکستان ان گناہوں کی سزا، غفلتوں کی جزا اور شامتِ اعمال سے توبہ کی تحریک ہے۔ یہی اس رسالہ کا اصل موضوع ہے۔ لہٰذا یہاں تاریخ کی شخصی تقسیم کے ماتحت صرف اس دور کی نمایاں شخصیتوں کے نام اور ایک آدھ کارنامہ کا ذکر کیا جائے گا۔ مفصل حالات خود تاریخی کتب سے دریافت کریں۔

(۱) ڈوپلے:۔ اس سلسلہ میں پہلا نام ڈوپلے کا ہے۔ اس فرانسیسی گورنر نے ہندوستان میں ملکی سپاہیوں کو تربیت دے کر یورپین افسروں کے ماتحت غیر ملکی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی ابتداء کی۔ ہندوستانی حکمرانوں کی باہمی رقابتوں اور ان کی درباری بدنظمیوں سے یکسوئی اور بیگانگی رکھنے والے اجنبی کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں یہ بھی اسی کی دریافت تھی۔

(۲) کلائیو:۔ کلائیو کو انگریزوں کا ڈوپلے کہا جائے تو بجا نہ ہوگا لیکن وہ ڈوپلے سے بڑھ گیا۔ ۱۷۴۹ء سے لے کر ۱۷۷۲ء کا زمانہ جب کہ وہ بیشتر ہندوستان میں قیام پذیر رہا۔ دراصل یہاں انگریزی سلطنت کی بنیادیں استوار ہونے کا زمانہ ہے۔ کرناٹک کی دوسری اور تیسری لڑائیاں اور پلاسی اور بکسر کی لڑائیاں جیت کر انگریزوں نے ہندوستان میں کھڑے ہونے کو جگہ حاصل کرلی تھی۔ اب صرف بیٹھنے اور ٹانگیں پھیلانے کی کسر تھی۔

(۳) احمد شاہ ابدالی:۔ اس وقت کے عالمِ اسلام کی کیفیت کسی حد تک احمد شاہ ابدالی کی شخصیت سے واضح ہے۔ آباؤ اجداد نے توحید کا جو جذبہ دلوں میں صدیوں گرم رکھا تھا اولاد میں ابھی تک اس کا یہ جوش باقی تھا کہ میدانِ جنگ میں مرہٹوں کو شکست دے دیتے ہیں لیکن تمدن، تدبر اور انتظام کی توحید مفقود ہو چکی ہے۔ لہٰذا پانی پت کی تیسری لڑائی کا فاتح پانی پت کی پہلی دو لڑائیوں کے فاتحوں کے برعکس ہندوستان میں کوئی سلطنت قائم نہیں کرسکتا۔

(۴) رنجیت سنگھ:۔ کھیتوں اور دیہات کے ناخواندہ جاٹوں میں گورونانک ایک بھگتی کی توحید تو پیدا کر گئے لیکن یہ توحید اپنے عین دُنیاوی عروج کے وقت بھی کیسی دُھندلی اور بھٹکتی ہوئی توحید تھی۔ یہ رنجیت سنگھ کی شخصیت سے واضح ہے۔ رنجیت سنگھ اگر ایک طرف دربار کا مدبر، میدانِ جنگ کا سپاہی اور گورو کا بھگت تھا تو دوسری طرف اربابِ نشاط کی نیازمندی سے بھی آزاد نہ تھا۔

(۵) وارن ہسٹنگز:۔ کلائیو کے متعلق کہا جائے کہ انگریز ہندوستان میں پاؤں جما رہا تھا تو ہسٹنگز کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اب انگریز ہندوستان میں بیٹھ گیا۔ ۱۷۷۲ء سے لے کر ۱۷۸۵ء تک جبکہ وارن ہسٹنگز ہندوستان میں رہا۔ ۱۷۷۲ء میں ریگولیٹنگ ایکٹ کے ذریعہ گورنر جنرل ہندوستان کا عہدہ قائم ہوا۔ مرہٹوں کی پہلی لڑائی انگریزوں نے کسی حد تک جیتی۔ میسور کی دوسری لڑائی ہوئی۔ راجہ نند کمار، بیگماتِ اودھ اور راجہ چیت سنگھ پر ستم ٹوٹے۔ کلکتہ میں صدر نظامت اور صدر عدالت قائم ہوئیں۔ غرض انگریزی طاقت ہندوستان میں جم گئی۔

(۶) ٹیپو:۔ اسلام نے فرنگی اور بچے برہمن کے بڑھتے ہوئے اقتدار کے خلاف سلطنت اور میدانِ جنگ میں جو آخری جان توڑ کوشش کی اس کا مظہر حیدر علی اور ٹیپو ہیں۔ ان کی شکست کی وجہ یہ تھی کہ دلوں کی توحید تو یقیناً حاصل تھی لیکن دماغ اور جسم کی توحید سے بے بہرہ تھے۔

(۷) لارڈ ولزلی:۔ کلائیو انگریز کے ہندوستان میں پاؤں جمانے اور ہسٹنگز بیٹھ جانے کا مرقع تھا تو لارڈ ولزلی ٹانگیں پھیلانے کی تصویر ہے۔ سبسڈیری سسٹم جاری کرکے تمام ہندوستانی حکمرانوں کے گلے میں طوقِ غلامی ڈال دیا گیا۔ یہ گورنر جنرل ۱۷۹۸ء سے لے کر

۱۸۰۵ء تک ہندوستان رہا ہے۔ اس دوران میں نظام دکن نے اطاعت فرنگ قبول کی۔ میسور کی چوتھی لڑائی سے حیدر علی اور سلطان ٹیپو کی سلطنتِ خداداد کا خاتمہ ہوا۔ انگریزوں نے بہت حد تک مرہٹوں کی دوسری لڑائی جیتی۔ نواب اودھ نے اطاعتِ فرنگ قبول کی۔ تنجور، کرناٹک اور سورت براہِ راست انگریزی علاقہ میں شامل کر لئے گئے۔

(۸) نانا فرنویس:۔ بچے برہمن نے فرنگی کے اقتدار سے بچنے کے لئے سلطنت اور میدانِ جنگ میں جو آخری جان توڑ کوشش کی اس کی کہانی نانا فرنویس کی زندگی میں دیکھی جا سکتی ہے۔

(۹) شاہ ولی اللہ دہلویؒ:۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا بیشتر مذہبی فلسفہ علمائے بلخ کے نقشِ قدم پر چلتا رہا۔ حضرت شاہ ولی اللہ آخری مسلمان صوفی اور عالم دین ہیں جنہوں نے یہاں کے حالات کے پیشِ نظر اسلامی ضابطۂ حیات کی تفصیلی تفسیر کی۔ ۱۱۱۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۷۶ھ میں فوت ہوئے۔

(۱۰) بابو بنکم چندر:۔ یہ بنگالی برہمن ۲۹/ جون ۱۸۳۸ء کو پیدا ہوا۔ ۱۸۵۸ء میں بی۔ اے کر کے ڈپٹی بن گیا۔ ۱۸۷۲ء میں پنشن لے کر رسالہ "بنگ درشن" نکالا۔ ۱۸۹۴ء میں مر گیا۔ بندے ماترم کا گیت اس کی تصنیف ہے۔ بچے برہمن میں مذہبی عصبیت کو وطنیت کا رنگ اس شخص نے دیا۔ ہندوستان کا تصور بطور ماں کے اس نے پیدا کیا۔ کانگرس کی تحریک جو قومیت کا رنگ لے کر اٹھی وہ اسی کی تصنیفات کا نتیجہ تھا۔

(۱۱) حالی:۔ سرسید نے مسلمانوں کو فرنگی کا تمدن اور علم اختیار کر کے ملازمت ڈھونڈنے کی جو تلقین شروع کی تھی اس نے حالی، شبلی اور نذیر احمد کی نظم و نثر سے مسلمانوں میں وقتی طور پر خاصی مقبولیت حاصل کی۔ حالی کا رنگ یہ تھا کہ ماضی پر فخر اور حال میں زمانہ سازی کی تلقین۔ حالی کی نظموں نے مسلمانوں میں جو بیداری پیدا کی اس کا فوری اثر تو عارضی تھا لیکن اپنی گزشتہ عظمت کی یادگار برقرار رکھنے میں ان کا نتیجہ پائیدار ثابت ہوا۔

(۱۲) اکبر الہ آبادی:۔ حالی خالی ماضی پر فخر کرتا تھا اور زمانہ حال میں فرنگی تمدن قبول کرتا تھا۔ برعکس اس کے اکبر ماضی پر بھی ناز کرتا تھا لیکن اس سے زیادہ فرنگی تمدن اور ضابطۂ حیات سے متنفر تھا۔ اگر حالی نے اسلامی ماضی کی یاد برقرار رکھی تو اکبر نے ہمیں اپنے موجودہ ماحول سے نفرت کرنا سکھایا۔

☆/☆/☆/☆

۱۹۰۷ء سے لے کر ۱۹۵۷ء تک

آموختہ:۔

سابقہ فصل میں ہم نے ۱۷۰۷ء سے لے کر ۱۹۰۷ء تک دو سو سال میں مسلمانانِ ہند کے زوال پر ایک چھلتی ہوئی نظر ڈالی ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اسلام جب عرب سے اٹھ کر چاردانگِ عالم میں پھیلا تو اس کی بنیاد توحید پر تھی۔ توحید کے عارفانہ معنی تو عارف ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ وہ لفظوں میں بیان ہونے والی شے نہیں۔ لیکن دُنیاوی زندگی میں توحید کے معنی یہ تھے کہ حاجت سے لے کر آرزو تک، آرزو سے لے کر تمنا تک، تمنا سے لے کر ارادہ تک، پھر فرد سے لے کر معاشرت، عقائد، رسوم، قانون، تمدن، اخلاق، اقتصاد، سیاست اور جہاد غرض زندگی کی تمام سچائیوں کی تہہ میں ایک بنیادی سچائی کی اکائی موجود ہے۔ تمام زندگی اس بنیادی اور مرکزی محور کے گرد گھومتی ہے۔ ہم جو کچھ سوچتے ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں وہ سب ایک ایمانی وحدت کے تابع ہے۔ ایمان زندگی سے کوئی اجنبی شے نہ تھی بلکہ زندگی کا ست اور نچوڑ ایمان تھا۔ شخصیت اور کائنات بلکہ کائنات سے بھی ماوراء حقائق سب اس ایمان کی اکائی کے تابع تھے۔ اس توحید، اس وحدت کو ہم اللہ کی علامت سے پکارتے تھے۔ تھا تو سادہ سا نسخہ لیکن دُنیا کی تمام سادہ چیزوں کی طرح خاصہ پُر اسرار اور مشکل۔ چوبیس گھنٹے متوجہ رہنا پڑتا تھا۔ بس یہی اس کی ریاضت تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی ہوش کو یوں پکڑنا پڑتا تھا کہ پھر مر کر بھی غفلت طاری نہ ہو۔ اسلام نے یوں شخصیت اور فرد کو تمدن کی اکائی قرار دے کر نسل، نسب، ملک، قومیت اور ایسے تمام جدائی کے بُت توڑ ڈالے تھے اور ان سب کی جگہ اکٹھا کرنے والا اللہ ہم پر حاکم کر دیا تھا۔ بات تو مزے اور مستی کی تھی لیکن چوبیس گھنٹہ کی توجہ اور ہوش بھی آسان نہیں۔ ہمت تھک جاتی ہے۔ آلاتِ توجہ کو زنگ لگ جاتا ہے۔ رسوم توجہ مردہ ہو جاتی ہیں۔ ارادہ غافل ہو جاتا ہے۔ اکساہٹ ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ چِتا گھبراتی ہے۔ من بھٹک جاتا ہے۔ تن کھو جاتا ہے۔ ہما شا کی کیا بات ہے، اچھے اچھوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ ایسے میں ہی بڑی بڑی شخصیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ اللہ کے بھیجے ہوئے ولی، پیر اور مردانِ خدا کچھ ایسی مقناطیسی کشش رکھتے ہیں کہ خود تو خیر سنبھلتے ہی ہیں دوسروں کو بھی سنبھال لیتے ہیں۔

ان دو سو سال میں مسلمانانِ ہند کی کمبختی یہ ہے کہ کوئی ایسا مردِ خدا باہر نہ نکلا جو ہماری بکھرتی ہوئی توحید متحد کر دیتا یا شائد ہماری ہی بدبختی تھی کہ مردانِ خدا کی دعوتِ توحید پر لبیک نہ

کہا۔ بیہوشی کی طرف ایسے جُھکے کہ ہوش آیا بھی تو پرواہ نہ کی اور رائگان گنوادیا۔

بہرحال جب ایمان کو زنگ لگا تو توحید کے پیچ ڈھیلے ہوئے۔ شریعت فروش، نواب، بنیا، برہمن، فرنگی اور بابو، ایک ایک کر کے طاعون کے کیڑوں کی طرح ہم پر لپک پڑے۔ ہم کیڑوں کی یورش سے بوکھلا کر ہاتھ پاؤں مارتے رہے اور اپنے تنِ بیمار پر توجہ نہ دی۔ دل کا روگ ٹھیک نہ کیا جو سارے مرض کی جڑ تھا۔ یہ چور اور ٹھگ کس طرح ہمارا ہی خون پی کر اور ہماری ہی جائیداد پر قبضہ کر کے ہمارے ہی رقیب اور حریف بلکہ حاکم ہونے کا دم بھرنے لگے۔ یہ عبرت ناک اور درد انگیز داستان سابقہ فصل میں بیان ہو چکی ہے۔

اگر ہم اس داستان کے موٹے موٹے واقعات پر نظر ڈالیں تو مندرجہ ذیل تاریخی تقسیم دکھائی دیتی ہے:۔

(۱) ۱۷۰۷ء سے لے کر ۱۷۵۷ء تک مُغلیہ سلطنت کا خاتمہ۔

(۲) ۱۷۵۷ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک تمام مُلکی طاقتوں کا خاتمہ اور فرنگی کا مکمل غلبہ۔

(۳) ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۰۷ء تک فرنگی کی ارادی یکسوئی میں خلل۔ ہندوستان میں انگریزی اثر کے ماتحت اینگلو ہندو اور اینگلو محمڈن طبقہ کی ابتدا اور انگلستان میں داخلی زوال، بین الاقوامی اثرات اور اینگلو ہندو اور اینگلو محمڈن تلقین سے ہندوستان کو خود مختار کرنے کا خبط۔

(۴) ۱۹۰۷ء سے لے کر ۱۹۳۷ء تک (۱) مسلمان، (۲) فرنگی، (۳) بابو، (۴) بنیے،

(۵) برہمن، (۶) شریعت فروش، (۷) نواب (۸) اینگلو محمڈن اور (۹) اینگلو ہندو طبقات کی مستقل لیکن غیر مسلسل اور غیر مربوط باہمی آویزش۔

(۵) ۱۹۳۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک مسلمانانِ ہند اینگلو محمڈن ہونے سے پھر مُسلم بننے کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

(۶) ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۵۷ء تک پاکستان کی تیاری اور پھر ۱۹۵۷ء میں پانی پت کی چوتھی اور آخری لڑائی۔

پہلے دونوں اَدوار کی تفصیل گزشتہ فصل میں مذکور ہو چکی ہے۔ باقی چاروں اَدوار کی کہانی ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۰۷ء تک اینگلو ہندو اور اینگلو محمڈن طبقات کا خروج:۔

زمانہ کے لحاظ سے تو اُس دور کے تمام واقعات کے ساتھ اینگلو ہندو اور اینگلو محمڈن طبقات کے خروج کا قصہ بھی گزشتہ فصل میں درج ہونا چاہئے تھا لیکن مضمون کے تسلسل کے اعتبار سے ہم نے اسے ۱۹۰۷ء کے بعد کے واقعات کے ساتھ شامل کر لیا ہے۔ فرنگی کے ہندوستان میں اقتدار اور تسلط پر ایک داستان ختم ہو جاتی ہے۔ فرنگی کا ارادی زوال، اینگلو ہندو اور اینگلو محمڈن کا عروج، پھر مسلمان کی غیرت کو تازیانہ لگنا اور پاکستانی تحریک کا بتدریج اسلامی تحریک بن جانا ایک نئی داستان ہے۔

فرنگی کی ارادی یکسوئی اُس کے اپنے نظامِ حیات کا نتیجہ تھی۔ بالعموم جب ہندوستانی فرنگی کے اقتدار کا تجزیہ کرتے ہیں تو فرنگی کے سائنس سے چکا چوند ہو جاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ فی نفسہٖ علم نہ کبھی طاقت اور اقتدار کی وجہ بنا ہے اور نہ یہاں تھا۔ قوت تو کردار اور شخصیت سے پیدا ہوتی ہے۔ علم محض اس قوت کا آلۂ کار ہوا کرتا ہے۔ فرنگی کا سائنس پروفیسروں کے تجربوں سے بنا تھا۔ لیکن فرنگی کا اقتدار خاندانی ریاستوں کے مالک "لارڈ" طبقہ سے تھا نہ کہ محض کسی پروفیسر کی بدولت۔ یہ درست ہے کہ پروفیسر اور تاجر بھی فرنگی سلطنت کے دست و بازو رہے۔ یہ بھی درست ہے کہ خود لارڈ طبقہ محض خاندانی رئیسوں پر مشتمل نہ تھا۔ وکیل اور عام لوگ بھی ترقی کر کے اس طبقہ میں شامل ہوتے رہے۔ لیکن ایسا ہوا کرتا ہے۔ گو دوسرے لوگ اس میں شامل ہوتے رہے اور اس کی مدد کرتے رہے لیکن فرنگی سلطنت کا انتظامی محور وہ لارڈ تھے جو صدیوں سے اپنی ریاستوں کے دیہات کا انتظام کرتے کرتے فطرتِ انسانی پر خاصہ عبور حاصل کر چکے تھے۔ خود انگلستان میں اب ایک صنعتی اور آہستہ آہستہ مجلسی انقلاب آ رہا تھا۔ اس انقلاب سے کمینہ خاندانوں اور سفلہ طبیعتوں کے لوگ برسرِ اقتدار آ رہے تھے۔ جنہوں نے "جمہوریت، لبرٹی اور خود مختاری" کے الفاظ تو رٹ لئے تھے لیکن خود وہ جو کچھ تھے بس وہی تھے۔ فرنگی سوسائٹی کے اس نسبی زوال کا نتیجہ چالیس پچاس سال میں ہی فرنگی سیاست میں ظہور پذیر ہونے لگا۔ وجہ یہ کہ جہاں تمدّن کی تباہی نسل پر ہو وہاں نسب نظر انداز کرنے سے فی الفور مہلک نتائج برآمد ہونا یقینی ہوتا ہے۔ پہلے ہندوستان کی کونسلوں میں ہندوستانیوں کو شامل کیا جانے لگا۔ پھر انتخاب کا اصول رائج ہوا اور آخر ۱۹۰۹ء میں کھلے بندوں ہندوستانیوں کو خود مختار کرنے کا چرچا ہونے لگا۔

فرنگی کے اس زوال کے ساتھ ساتھ ۱۸۳۹ء سے لارڈ میکالے کے رائج کردہ تعلیمی نظام سے ہندوستان میں پہلے ہندوؤں کے اندر اینگلو ہندو اور پھر مسلمانوں کے اندر اینگلو محمڈن مخلوط ذہنیت کے طبقات کا خروج ہونے لگا۔ ان لوگوں کا مذہبی اور مجلسی پس منظر تو آباؤ اجداد ہی

کا سارا لیکن سکول اور کالج میں تعلیم پا کر اور انگریزی اخبارات دیکھ کر اُن کے اخلاقی تصورات، روزہ مرہ کی زندگی اور عادات، سطحی عقائد اور حادثات عالم کی مروجہ تفسیریں قطعاً فرنگی سانچے میں ڈھل گئیں۔ مثلاً وہ کھاتے تو دال اور چپاتی یا پلاؤ ہی تھے اور گھر میں آتے ہی پتلون اُتار کر دھوتی یا تہہ باندھ لیتے لیکن جب وہ سوچتے کہ ہمارے آباؤ اجداد زمین کو سپاٹ کہتے تھے اور اب ہم فرنگی سائنس کی بدولت جانتے ہیں کہ زمین گول ہے تو ان پر ایک وجد طاری ہو جاتا ہے۔ پھر وہ سیاست اور ارتقاء اور مجلسی آداب میں بھی فرنگی نظریات غٹا غٹ قبول کر لیتے۔

ہندوؤں میں اس طبقہ نے مغربی نیشنلزم کی نقل اتارنی شروع کی۔ وہ بنیادی طور پر ہندومت کی اخلاقیات اور معاشرت کو قبول کرتے تھے۔ صرف اس پر فیشن اور جدت کا ملمع چڑھا لینا چاہتے تھے۔ مسلمانوں میں اس طبقہ نے انگریزی تعلیم، انگریزی ملازمت، تعلیم نسواں (مغربی نمونہ پر) اور بے حجابی پر زور دینا شروع کیا۔ تلک، گوکھلے اور لاجپت رائے اینگلو ہندو طبقہ کے علمبردار تھے۔ سرسید، شبلی اور نذیر احمد اینگلو محمڈن طبقہ کے بانی مبانی تھے۔

ان دونوں طبقات کے خروج کے ساتھ ساتھ ہندومت کو جدید شکل دینے کے لئے آریہ سماج اور اسلام کو نیا چولا پہنانے کے لئے وہابیت کی تحریکیں بھی چل رہی تھیں۔

اینگلو ہندو اور اینگلو محمڈن طبقات نے ہندو اور مسلمانوں کو تو یہ نقصان پہنچایا کہ اُن کے تمدن کی اصل شکلیں مسخ کر ڈالیں لیکن فرنگی کا یہ اپنا چلایا ہوا جادو خود اس کے اپنے سر پر بھی چڑھ کر بولے نہیں تو گنگنانے ضرور لگا۔ انگریزوں کا معاملہ فہم طبقہ تو خوب جانتا تھا کہ بابو کی طرح اینگلو ہندو اور اینگلو محمڈن بھی بس ورشی پہلوان ہیں۔ لیکن نو دولت اور سطحی فرنگی طبقات کو مغالطہ ہو رہا تھا کہ ہم نے شہروں میں نئی روشنی کے چند نقال کیا پیدا کئے ہیں اب ہندوستان بھی انگلستان کی طرح جمہوریت کا سزاوار ہے۔ دانا فرنگی طبقہ کے لارڈوں نے شروع شروع میں تو انگریزی اور ہندوستانی احمقوں کی اس خود فریبی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوستان میں اپنی سلطنت کی جڑیں مضبوط کیں اور اب تک وہ اس پردہ کی آڑ میں شکار کھیل رہے ہیں۔ لیکن جھوٹ دوہراتے دوہراتے خود جھوٹے کو بھی سچ کا گمان ہونے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب فرنگی کی رائے عامہ کا ایک معقول حصہ سچ مچ ہندوستان کو خود مختار کر دینے کے خبط میں گرفتار ہے۔ خبط یوں کہ جو آزادی وہ دینا چاہتے ہیں وہ تو یہاں چلتی نہیں اور جو آزادی یہاں ہوتی ہے وہ اُن کے وہم و گمان میں بھی نہیں۔

ہندوستان میں مغربی لعنتی پارلیمنٹری نظام کا نفاذ:۔

مشرق میں ہمیشہ دینی سیاست کا رواج رہا تھا جس کا اصول ہے کہ نیکی اور بدی کا قانون خدا مقرر کرتا ہے۔ انسانی اقتدار کا کام فقط اس قانون کو رائج کرتا ہے جو اس قانون پر چلیں، چاہے وہ تعداد میں تھوڑے ہوں وہ سچے ہیں، جو اس قانون کی خلاف ورزی کریں وہ جھوٹے ہیں چاہے وہ تعداد میں زیادہ ہوں۔ برعکس اس کے مغرب کی لادین سیاست میں نیکی بدی کا کوئی قائم بالذات اُصول نہ تھا۔ حتیٰ کہ رومن کیتھولک کلیسا اور پاپائے روم کا تقرر بھی پارلیمنٹری نظام کے نمونہ پر تھا۔ یہاں اصول یہ تھا کہ جو بات بہت سے لوگ کریں وہ نیکی ہے اور جس اصول کی حمایت کرنے والے تعداد میں تھوڑے ہوں وہ غلطی ہے۔ دراصل اس اختلاف کی بنا عقل اور جسم کے متضاد تقاضات پر ہے۔ حیوانات کی دُنیا میں دیکھو وہاں چونکہ عقل نے اپنا کام شروع نہیں کیا جس طرف بہت سی بھیڑیں چل نکلیں ڈھوروں کا باقی گلہ بھی اُدھر ہی کو بھاگنے لگتا ہے۔ برعکس اس کے عقل کا تقاضا اکثریت کی کیا پرواہ کرتا ہے۔

کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید!

یوں ہی مغربی تمدن جس کی بنا نسل پرستی پر ہے جسم اور زمین کے ساتھ حیوانی محبت کی تقلید کرتا ہے اس کی سیاست بھی ڈھوروں کے گلے کی طرح پارلیمنٹری اکثریت کے تابع ہے۔

یہ پارلیمنٹری نظام مغرب میں تو کام دے گیا جہاں ایک علاقے میں ایک ہی قسم کے مویشی بستے ہیں لیکن جہاں بھانت بھانت کے جاندار سکونت رکھتے ہوں وہاں تھوڑی تعداد والوں کو جلد ہی احساس ہونے لگتا ہے کہ اس اصول نے ہمیں تو مار ڈالا۔ زیادہ تعداد والے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آگے اور ہم ہمیشہ ہمیشہ پیچھے۔ یہ بڑی ناگوار صورت حالات ہے۔ یہی ہندوستان میں ہوا۔ جب پہلے پہل فرنگی نے اپنے پارلیمنٹری اصولوں کے مطابق ہندوستان میں سلطنت شروع کی تو کچھ عرصہ تو ہندو اور مسلمان دونوں ہی سٹ پٹا کر رہ گئے اور جوتیاں سینے والوں اور سبزی فروشوں اور جھاڑو دینے والوں اور طبلہ کھڑکنے والوں کی اولاد "بابو" بن گئی۔ شرافت بھوکی مرتی تھی اور اکثریت مزے لوٹتی تھی۔ آخر پہلے ہندوؤں میں گنوان ودیاوان تپسوی رشی منی برہمنوں اور اونچ نیچ دیکھے ہوئے سوجھ بوجھ رکھنے والے بیدوں نے روگ کا کھوج لگا کر دوا تجویز کر ہی ڈالی۔ وہ اس پارلیمنٹری نظام کی نبض پا گئے۔ بڈھے برہمن نے فرنگی کو مخاطب کر کے کہا "مہاراج! ہم بھی یگ یگ اور جنم جنم سے جمہوریت کے ماننے والے ہیں۔ آپ ہی کے پارلیمنٹری اصول کے معتقد

ہیں۔ لیکن دیکھئے نا اُس ملک میں اکثریت تو اس ملک کے رہنے والوں ہی کی ہے۔ اس لئے آپ حکومت ہندوستانیوں کو دیجئے۔ اب رہی یہ بات کہ ہندوستانی اس حکومت کو چلائیں کیسے۔ بس وہی مہاراج آپ کے ترقی یافتہ ملک کی طرح کونسل اور اسمبلیاں بنا کر، ووٹ دے کر، اگر ووٹ اُن لوگوں کے زیادہ ہیں جو صدیوں سے معاشرتی اور نفسیاتی طور پر ہمارے تابع ہو چلے آ رہے ہیں تو یہ محض اتفاق کی بات ہے۔ آپ کو کسی ملک کے خانگی کوائف کی کیا چنتا۔ آخر زندگی میں پارلیمنٹری اصول تو ترک نہیں کر دینا"!

فرنگی کے نو دولت اور سفلہ طبقے اس چکمے اور بھرّے میں آ گئے۔ معاملہ فہم اور زمانہ کے سرد و گرم چشیدہ "لارڈ" نے سوچا یہ پنجرے پال طوطے" اس کھلونے سے خوش رہیں تو ہمارا ہرج ہی کیا ہے۔ خود ممالک فرنگ اور خانۂ فرنگ کے نو دولتے اور سفلے، ہندوستانیوں کو ہمارے یہ کھلونے عطا کرنے سے ہمارے "ترقی پسند" ہونے کا اطمینان ہو جائے گا۔ اس وقت کی بین الاقوامی حالت بھی ایسے شعبدوں کے لئے سازگار تھی۔ بس ۱۸۹۲ء میں کیمبرے کلاز کے ذریعہ پہلی دفعہ ہندوستان کی کونسلوں میں نامزدگی کے ساتھ ساتھ الیکشن کا اصول بھی شامل کر لیا گیا۔

کچھ عرصہ کے لئے تو مسلمان بھی اس جھانسے میں آ گئے۔ مسلمان کیا جھانسے میں آ گئے۔ بات یہ ہے کہ مسلم عوام تو ابھی فرنگی اور بیچے برہمن کے ہاتھوں سلطنت گنوا کر ہی بھو چکے بیٹھے تھے۔ بس شریعت فروش، نواب اور اینگلو محمڈن لوگ ہی تھے جو ایسے معاملات میں مسلمانوں کے مختار مطلق اور وکیل بن کر فرنگی کے سامنے آ جایا کرتے تھے۔ مسلمان نے تو سالہا سال تک فرنگی سے یہ سلوک رکھا کہ حالانکہ وہ حاکم وقت تھا اور اس سے جدا رہنے میں ہزار محرومی برداشت کرنی پڑتی۔ لیکن اسلامی غیرت نے فاقے کاٹے، مگر غاصب اجنبی سے بات تک کرنا گوارا نہ کیا۔

ہاں تو کچھ عرصہ تک تو یہ بابو، شریعت فروش، نواب اور اینگلو محمڈن قسم کے مسلمان پارلیمنٹری نظام کے متعلق مغالطے میں رہے۔ پھر جو انہیں ہوش آیا تو یہ بھی خوب چیخے چلائے اور آخر ۱۹۰۸ء میں منٹو مارلے اصلاحات کے ساتھ مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب نافذ ہوا۔

مسلمانوں کے لئے یہ علیحدگی کچھ بہت مبارک ابتداء نہ تھی۔ وجہ یہ کہ اس کی باگ دوڑ ایسے ہاتھوں میں تھی جو اسلام کے تسخیر عالم کے پروگرام سے قطعاً نابلد تھے۔ انہیں یہ بھی علم نہ تھا کہ مسلمان دوسروں سے آخر کیوں جدا ہیں۔ بس وہ صرف اتنا جانتے تھے کہ ہم جدا ہیں۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد کچھ عرصہ تک تو مسلمانوں کی حالت اس لٹے ہوئے مسافر کی طرح رہی جو تھوڑے وقفہ کے لئے بھونچکا سارہ جاتا ہے۔ ابھی ایک ملک کی شہنشاہیت

ہاتھ میں تھی اور ابھی قسمت نے کروٹ جو لی تو سلطنت انگریز کے ہاتھ میں اور انگریز کی تجارتی، انتظامی اور تعلیمی خلافت مدراس اور بنگال کے ہندو بابوؤں کے حصے میں۔ یہ تو احساس ہوا کچھ چھن گیا ہے۔ لیکن یہ کسے ہوش کہ کیا چھن گیا ہے۔ کسی نے کہا سیاست چھن گئی، کوئی پکارا تجارت ہاتھ سے گئی، کسی نے دین پر توجہ دی، کسی نے تعلیم جدید کی ضرورت پر زور دیا۔ غرض ہر ایک اپنا اپنا قافلہ بنا لٹی ہوئی پونجی کا جو تصور دماغ میں بیٹھا اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ صرف گنتی کے ہوش مند تھے جنہوں نے سمجھ لیا کہ شامتِ اعمال و افکار سے توحید چھن گئی ہے۔ سب کچھ ہی لٹ گیا ہے اور واپس ملے گا تو اکٹھا ہی واپس ملے گا۔ مگر اس نقار خانہ میں طوطی کی کون سنتا تھا۔ حکومتِ وقت کو اینگلو محمڈن تعلیم کے متلاشی منظور نظر ہوئے اور نتیجہ یہ نکلا کہ سرسید اور ان کے حواریوں کا ٹولہ ہنگامی طور پر غالب ہو گیا۔

اب سرسید کی اقتداء میں تعلیم کا شوق پھیلا تو عوام میں یہ احساس تو برقرار رہا کہ ہم مسلمان ہیں۔ دوسروں سے جدا ہیں لیکن وہ بھی بوجھی یاد کہ ہماری سیاست اور دین اور ساری زندگی ایک وحدت ہے اور بھی بھولی بسری داستان بن گئی۔ علی گڑھ کے "مہذب اور تعلیم یافتہ" نوجوانوں اور اُن کے زیر اثر لوگوں کے لئے ناممکن تھا کہ وہ مسلمانوں کی معاشرتی، اقتصادی، سیاسی اور دینی خصوصیات کو دوسرے پڑھے لکھے ہموطنوں کے سامنے تبلیغی رنگ میں پیش کرتے۔ اپنے تئیں بہتر قرار دیتے اور دوسروں کو اپنی کسوٹی پر پرکھتے، جو کہ اسلام کی منشا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایسا کر بھی نہ سکتے تھے۔ ایسا کرنے کے لئے اگر دوسروں سے بہتر ہونا شرط نہ بھی ہوتا تو دوسروں سے مختلف ہونا یقیناً لازمی و لابدی تھا۔ لیکن وہ تو بالکل دوسروں جیسے ہی تھے۔ جب دو گروہ عادات میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوں تو ان کی کوششوں کا یکجا ہو جانا محض وقت کی بات ہوا کرتی ہے۔ یوں اینگلو محمڈن اور اینگلو ہندو طبقات کی ہنگامی مشابہتوں سے ہندوستان میں متحدہ قومیت کا منحوس، بدبخت اور نامراد دور شروع ہوا۔ منحوس اور بدبخت تو اسلامی زاویہ نگاہ سے کیونکہ مسلمانوں نے اپنا جداگانہ مقام فراموش کر دیا۔ نامراد خود اس اتحاد کے انجام کی رُو سے کیونکہ عادات کی مشابہتیں سطحی تھیں۔ دلوں کی تہ میں وہی یثربی تہذیب اور پراچین بھیتا زندہ کرنے کے ولولے کروٹیں لے رہے تھے۔

۱۹۰۷ء سے لے کر ۱۹۳۷ء تک:۔

اس تیس سال کے عرصہ میں تین تحریکیں قابل توجہ ہیں۔ اول خلافت عثمانیہ کا استیصال

اور اس پر مسلمانانِ ہند کا اضطراب، دوسرے گاندھی کی ستیہ گرہ اور سوراج کی تحریک، تیسرے مسلمانوں میں تبلیغ، ہجرت آرتی نماز، شہید گنج کی قسم کی تحریکیں۔

اوّل۔ تحریکِ خلافت:۔

۱۹۱۱ء کے بعد جب ممالکِ افرنگ نے آہستہ آہستہ خلافتِ عثمانیہ کے علاقے غصب کرنے شروع کیے تو مسلمانانِ ہند کی خوابیدہ توحید از خود ان چرکوں سے تلملا کر بیدار ہوئی۔ طرابلس، بلقان اور ۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم کے ساتھ خلافتِ عثمانیہ کے زوال میں سے ہر ایک واقعہ کے ساتھ ہندوستان میں ایک تحریک اٹھی۔ مسلمانوں نے ان گنت اور بے انتہا قربانیاں دیں۔ مقاصد بلند تھے لیکن طریقۂ کار واضح نہ ہونے کے باعث شکست ہوئی۔ اسی ضمن میں بنیئے برہمن کے ساتھ اتحاد کر کے عدم تشدد اور عدم تعاون کی تحریک بھی چلائی گئی لیکن بنیا مہاتما چورا چوری کا عذر بیچ میں رکھ کر عین وقت پر جل دے گیا۔

دوم۔ تحریکِ ستیہ گرہ:۔

موجودہ صدی کے ہندوستان میں موہن داس کرم چند گاندھی وہ پہلا شخص ہے، جس نے احساس کیا کہ تکمیل مقاصد کے لئے انہیں مقاصد کی رعایت سے طریقۂ کار ایجاد نہ کیا جائے تو کامیابی ناقابل تصور ہے۔ بنیا برہمن فلسفہ کی رعایت سے اُس نے ستیہ گرہ اور چرخہ کا ہتھیار اور علامت بھی ایجاد کی۔ ہم اُسے مقصد اور طریقۂ کار کی وابستگی دریافت کرنے پر شاباش کا سزاوار قرار دیتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کی بنائے قوم اور فلسفہ ہی ایسا بودا ہے کہ اس سے کوئی کام کا ہتھیار یا علامت ایجاد ہی نہیں ہو سکتے۔

سوم۔ مسلمانوں کی متفرق فرقہ وارانہ تحریکیں:۔

گاندھی کے جواب میں تبلیغ، ہجرت، آرتی، نماز کے جھگڑے، تعزیوں پر فسادات، مسجد کانپور میں گولی چلنا، ۱۹۲۳ء کے فرقہ وارانہ فسادات، ۱۹۲۹ء میں نہرو رپورٹ کے خلاف ایجی ٹیشن، تحریک شہید گنج اور اس قسم کی دوسری مسلمانوں کی وقتی فرقہ وارانہ تحریکیں جو ۱۹۲۳ء سے لے کر ۱۹۳۶ء تک چلتی رہیں۔ اگرچہ فی نفسہٖ کوئی نتیجہ پیدا نہ کر سکیں لیکن ان کا یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ متحدہ قومیت کا بت آہستہ آہستہ پاش پاش ہو گیا۔

۱۹۳۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک اینگلو محمڈن سے پھر مسلم:۔

گو اب مسلمانانِ ہند کی توحید ٹوٹ چکی تھی وہ اپنا مقصدِ حیات فراموش کر چکے تھے۔

لیکن خوبیٔ قسمت دیکھئے کہ ہندوستان میں ایسا کوئی فلسفہ یا طاقت نہ تھی جو دس کروڑ انسانوں کو مٹا سکتی یا اپنا سکتی۔ یوں ۱۹۳۷ء میں جب کانگرسی وزارتوں نے اس دس کروڑ کے گروہ پر مظالم توڑنے شروع کیے تو نفی ردِ عمل سے ان کو بھولا ہوا سبق پھر یاد آ گیا۔ جب سر پر بے بھاؤ کی پڑیں تو خوب غور کیا کہ آخر ہم ایسے کیوں بن گئے۔ وہیں پرانی یاد چنگاری کی طرح چمکی۔ یہی مسلمانوں کی علیحدگی کی تحریک تھی۔ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ نے قرار دادِ لاہور منظور کی۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک اس قرارداد کو منوانے کی کوشش میں فراموش توحید پھر سے یاد آ گئی۔ جنوں نے اللہ سے ملا دیا۔ نفی سے اثبات ہو گیا۔

۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۵۷ء تک پانی پت کی چوتھی اور آخری لڑائی کی تیاری:۔

اس رسالہ کے مطالعہ کے بعد ۱۹۴۷ء تک مسلمانانِ ہند کو اپنے مخصوص جداگانہ مقام کا علم ہو گا۔ اس کے بعد دس سال تک اس رسالہ کے بیان کردہ طریق عمل کے مطابق ہندوستان میں حق و باطل اور کفر و اسلام کی آخری لڑائی کی تیاری ہو گی۔ ۱۹۵۷ء میں جنگ پلاسی کے دو سو سال بعد اور ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے ایک سو سال بعد پانی پت کے میدان میں وہ معرکہ ہو گا جو پانی پت کی چوتھی لڑائی کہلائے گا۔ پانی پت کی تیسری لڑائی میں ابدالی نے مرہٹوں کو پاش پاش کر دیا تھا۔ اس چوتھی لڑائی میں فرنگی، بنیئے، برہمن، نواب اور اینگلو محمڈن کو ختم کر دیا جائے گا۔

☆/☆/☆/☆

﴿دین، تمدن، قوم اور سلطنت ہمیشہ کوئی مردِ خدا تعمیر کرتا ہے﴾

مردِ خدا:۔

انسانی زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو تمام اخلاق، تمدن، علوم وفنون، سیاست، رسوم ورواج اور آئین کی بنیاد فرد کے چند حوائج، کچھ عقائد، بعض مشاہدات، جذبات، حرکات اور فطری خصوصیات کے الٹ پھیر یا جوڑ توڑ کی بیشی اور اونچ نیچ پر ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کائنات کی تمام حقیقت وافسانہ کی بنیاد حضرت انسان کے انہیں مشاہدات، جذبات، حرکات اور عقائد پر ہے۔

یہاں کے نیک وبد اور سچ جھوٹ کو متعین کرنے والا سوائے انسان کے اور کوئی نہیں اور جو ہے وہ بھی اپنے آپ کو بغیر حضرت انسان کی وساطت کے ظاہر نہیں کرتا۔ زلزلے اور طوفان تو انسان کی مدد کے بغیر بلکہ بسا اوقات اس کی مرضی کے خلاف آجاتے ہیں لیکن دین، تمدن، قوم اور سلطنت ہمیشہ کوئی انسان ہی تعمیر کرتا ہے۔ خود قدرت دین بدلنا چاہے، تمدن پلٹنا چاہے، کسی قوم کو مٹانا چاہے، کسی نئی سلطنت کی بنیاد رکھنا چاہے تو کسی چنگیز یا کسی پیغمبر کا سہارا لیتی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے جب انسان کے مشاہدات، جذبات اور حرکات دُنیا بھر میں کم وبیش یکساں ہیں اور ہمیشہ سے یکساں چلے آئے ہیں تو پھر دین، تمدن، اقوام اور سلطنتوں میں یہ تفاوت اور رقابت کیوں۔ اس کا جواب ہے عقائد کا اختلاف۔ گو ہمارے مشاہدات، جذبات اور حرکات یکساں ہیں۔ لیکن ہمارے عقائد اور طبیعتیں مختلف ہیں۔ ایک ہی سورج آسمان پر چمکتا ہے۔ تمام انسان اس کی روشنی یکساں دیکھتے ہیں لیکن افریقہ کے کسی وحشی قبیلہ کا کوئی حبشی دیکھتا ہے تو سمجھتا ہے یہ سورج دیوتا مجھے غصّے سے گھور گھور کر دیکھتے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ابھی ایک انسان کا گلا کاٹ کر میرے مندر پر بھینٹ چڑھا۔ عرب کے صحرا میں کوئی بادیہ نشین مسلمان دیکھتا ہے اور کہتا ہے اب سجدہ حرام ہوگیا۔ گنگا کے کنارے ایک برہمن دیکھتا ہے اور کہتا ہے کہ اب سر جھکانے کا وقت آگیا۔ کوئی ہندوستان کا راجہ دیکھتا ہے اور کہتا ہے کہ فلاں راگ سُننے کا وقت ختم ہوا۔ اب فلاں راگ سُنایا جاسکتا ہے۔ جاٹ کو کھیتی باڑی کا خیال آتا ہے۔ چپڑاسی کو صاحب بہادر کی خوشنودی کی خواہش ہوتی ہے اور حضرت سائنسدان نظر پڑتے ہی دُور بین گھمانے لگتے ہیں کہ آج فلاں سال کے فلاں مہینے کے فلاں دن سورج کے شعلوں میں پلاٹینم کی جھلک زیادہ

ہے یا یورینیم جلنے کا عمل غالب ہے۔

ثابت ہوا یہ انسانی عقائد کا اختلاف ہے جو دُنیا کے مختلف اور پھر تاریخ کے مختلف ادیان، تمدن، اقوام اور سلطنتیں پیدا کرتا ہے۔ لیکن یہ عقائد کا اختلاف پیدا کرنا بھی ہر انسان کے بس کا نہیں۔ اکثر انسان دوسروں کے بجھائے ہوئے یا چلے ہوئے ڈگر پر ہی چلتے رہتے ہیں۔ یہ تو کوئی خاص چنچل اور چونچال طبیعت ہوتی ہے جو کسی نئے عقیدہ کا راستہ دریافت کرتی ہے۔

پھر ان نئے عقائد ایجاد کرنے والوں کے بھی درجے ہیں۔ چار ہزار سال قبل مسیح یا آٹھ ہزار سال قبل مسیح نہ جانے کس بل والے برہمنوں کے جنم داتا نے منڈیا کی چھنگی پر بالوں کی مٹھی بھی چوٹی رکھ کر ڈیڑھ گانٹھ دی تھی کہ آج دس ہزار سال بعد بھی لاکھوں ہندو اس کی تقلید کررہے ہیں۔

یہ درجے ایک تو اثر پذیرائی کے اعتبار سے مقرر کئے جاسکتے ہیں۔ پھر یہ بھی دیکھنا ہے کہ ان عقائد کا فائدہ یا نقصان کتنے انسانوں کو پہنچا۔ بحیثیت مجموعی فائدہ زیادہ تھا یا نقصان۔ باقی رہنے والا اثر سود مند ہے یا نقصان دہ۔ وغیرہ وغیرہ۔

بسا اوقات چھوٹے دائرہ کا مردِ خدا بڑے دائرہ کے مردِ خدا کے مجوزہ مسلّمات قبول کرکے ان کے حلقہ کے اندر اپنی ایجاد دکھاتا ہے۔

اس طرح اگر کوئی مردِ خدا محض وقتی ضروریات پوری کرتا ہے تو وہ ایک وقتی لیڈر ہے۔ اگر وہ کوئی مجلسی انقلاب برپا کرتا ہے تو وہ مصلحِ قوم ہے۔ اگر وہ رُوحانیات اور اخلاق کی مناسب وقت بنا برقرار کرتا ہے تو وہ حسبِ حیثیت ولی یا قطب ہے۔ ان سب سے اوپر مقام پیغمبروں کا ہے۔ جنہوں نے اُمتوں کی بنیادیں رکھیں۔

اُمت اسلامیہ کے بانی نے اُس کی بنیاد توحید پر رکھی تھی۔ توحید کی اصلیت تو ہمیشہ ایک ذہنی تھی۔ لیکن اس کے اظہار کے لئے ہر زمانہ کی توحید دریافت کرنی بھی ضروری تھی۔ ابدی اصولوں کو وقتی اصطلاحات کے ذریعہ تازہ کرتے رہنا تھا۔ اسلام کی تاریخ میں یہ کام ہمیشہ مختلف مردانِ خدا سرانجام دیتے رہے۔ چونکہ اُمتِ اسلامیہ ختمِ نبوت پر عقیدہ رکھتی ہے اس لئے اولیائے اللہ اور مردانِ خدا کا منصب اس اُمت میں اور بھی زیادہ اہم ہے۔

پاکستان اور مردِ خدا:۔

اگر ہم پاکستان قائم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں مردِ خدا کے مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔ پاکستان کے معنی ہیں ایک ایسا تمدن، ایک ایسی سلطنت، ایک ایسی اُمت جس کی بناء محض

توحید اور ایمان پر ہو۔ توحید اور ایمان دونوں کی بنا نفوسِ قدسیہ پر ہوتی ہے۔ مردانِ خدا کی مدد کے بغیر ہم پاکستان کیسے بنا سکتے ہیں۔

دین کے معنی مردِ خدا کی ذات ہی معین کر سکتی ہے:۔

آج مسلمان کی تمام ظاہری کمزوری کا اصل باعث اس کے کردار اور شخصیت کی اندرونی کمزوری ہے۔ کردار کی کمزوری کا باعث یہ ہے کہ اُسے اپنے عقیدوں پر ایمان نہیں رہا۔ عقیدوں پر ایمان اس لئے نہیں رہا کہ وہ عقیدے روزمرہ کی ضروریات اور حقیقتوں سے دُور نظر آتے ہیں۔ قوم کے افراد کو ان عقائد سے اپنی فوری مشکلات کے حل میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ اسلامی عقیدوں سے مسلمانوں کی مشکلات کے حل میں یوں مدد نہیں ملتی کہ عوام ان عقائد کا اطلاق اپنے ماحول پر نہیں کر سکتے۔ قوم ماحول پر عقائد کا اطلاق کرنے سے یوں قاصر ہے کہ کوئی ایسا شخص نہیں جو ان عقائد اور ماحول کا غائر مطالعہ کر کے لوگوں کو بتا دے کہ ان کا باہمی رشتہ کیا ہے۔ یہ کام عوام کا نہیں بلکہ قومی لیڈرشپ کا ہے۔

شخصیت اس لئے دوغلی ہو رہی ہے کہ جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ اس سے بالکل متضاد ہے جدھر ہمارا ماحول جا رہا ہے۔ جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ ہوتا نہیں اور جو کچھ ہوتا ہے وہ ہم چاہتے نہیں۔ لازماً کمزور طبیعتوں کی چاہت پر اس کا بُرا اثر ہوتا ہے۔ یہاں پھر ضرورت ہے کہ تجزیہ کر کے دریافت کیا جائے کہ ہم جو کچھ چاہتے ہیں کیوں چاہتے ہیں۔ جو کچھ ہوتا ہے وہ کیوں ہوتا ہے۔ اس طرح جو بنیادی حقائق دریافت ہوں گے وہاں ہم آرزو اور جستجو کے ڈانڈے ملا کر پھر ایک مرتبہ اپنے آپ کو حقائق سے اور حقائق کو اپنے آپ سے مطابقت دے سکیں گے۔

آرزو اور واقعات، مشاہدہ اور حقائق کی یہی توحید ہے جس کے دریافت کرنے سے ہم طاقتِ ایمانی حاصل کر سکیں گے۔

طاقتِ ایمانی اور مردِ خدا:۔

اسلامی ضابطۂ حیات کا طریقہ کار داخلی اور انقلابی ہے نہ کہ خارجی اور آئینی۔ آزادی، تحفظِ حقوق اور قومی وقار کوئی ایسی خیرات نہیں جو دوسروں کے دروازے پر کھڑے ہو کر چلانے سے میسر آ جائے نہ ہی یہ کسی کے باپ دادا کی جائیداد ہے جو قانونی مقدمے لڑنے سے مل جائے۔ یہ تو کرنے کی بذیا ہے جس طرح پانی پنسال میں خود بخود جمع ہو جاتا ہے اسی طرح آزادی اور حکومت کے قابل قومیں بھی بغیر کسی سے پوچھے گچھے، بغیر کسی کا شکوہ کئے، بغیر تحفظات یا مراعات کا

مطالبہ کئے خود بخود آزاد اور حاکم بن جایا کرتی ہیں۔

ہمارے تنزل اور ہماری شکست کا باعث ہمارا باہمی نفاق، ہماری اقتصادی کمزوریاں، ہمارے دشمنوں کا تازہ دم ہونا، ہمارے اندر کسی مرکزی طاقت کا فقدان، یا دانایانِ فرنگ کے جدید آلات و قواعدِ حرب نہ تھے۔ یہ سب تفاوتیں ایک فریق کی اندرونی کمزوری کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں۔ یہ اس کا سبب یا باعث نہیں ہوتیں۔ قوم کی بقا اور اقتدار کا اصل راز اس کے سینے میں محفوظ ہوا کرتا ہے۔ اگر اس کا ایمان قائم رہے تو وہ دیر یا زُود ان تمام خارجی کمزوریوں پر غالب آ جاتی ہے۔ لیکن اگر اس کی اخلاقی اور رُوحانی قوت ختم ہو چکی ہو، اگر اسکی طاقت کے اندرونی چشمے خشک ہو چکے ہوں تو بہترین دُنیاوی ساز و سامان بھی اُسے ذلت سے نہیں بچا سکتے۔ رُوم باوجود اپنے وقت کی زبردست ترین طاقت ہونے کے چند وحشی قبائل کے ہاتھوں برباد ہو جاتا ہے اور جرمنی پہلی جنگِ عظیم میں ہر طرح تباہ ہو کر بھی دوسری جنگِ عظیم کا باعث بن جاتا ہے۔

طاقتِ ایمانی کے لئے کسی وسیع کتابی علمیت یا لمبی تربیت کی ضرورت نہیں۔ طاقتِ ایمانی ہمیشہ کوئی مردِ خدا قوم میں پیدا کرتا ہے۔ اس کی ایک نظر سے غلاموں کے نصیبے پلٹ جاتے ہیں۔ دشمنوں کے تخت اُلٹ جاتے ہیں، مردِ خدا یہ کام کسی جادو یا افسوں سے نہیں بلکہ بعض ازلی وابدی اور متعارف اُصولوں کے ماتحت سرانجام دیتا ہے۔ وہ پہلے ایک ضابطۂ حیات پیش کرتا ہے۔ قوم پر اس ضابطۂ حیات کی اشد ضرورت واضح کرتا ہے۔ قوم کی تمام گذشتہ ناکامیوں کا رشتہ اس ضابطۂ حیات سے انحراف کے ساتھ جوڑتا ہے۔ قوم کی تمام ضروریات کا حل اس ضابطۂ حیات کو ثابت کرتا ہے اور قوم کی تمام خواہشات اور سعی کا مرکز اس ضابطۂ حیات کو بنا دیتا ہے۔

جب کسی شخص یا قوم کی تمام خواہشات اور طاقتیں کسی ایک نقطہ پر جمع ہو جائیں تو چاہے وہ شخص یا قوم پہلے کیسی ہی کمزور نظر آتی ہو اس تبدیلی کے بعد وہ محیر العقول کارنامے سرانجام دینے لگتی ہے۔ اس کی سابقہ عظمت لوٹ آتی ہے۔ دلوں میں ولولے پیدا ہو جاتے ہیں۔ ضروریاتِ زمانہ کے تقاضوں کا احساس اور علاج بیک وقت ہو جاتا ہے، ذلت عزت سے بدل جاتی ہے۔ کھویا ہوا اقتدار پھر ہاتھ آ جاتا ہے۔ جو کل تک ظالم آقا یا خشمناک حریف تھے وہ مطیع اور فرمانبردار ملازم یا ہوا خواہ دوست بن جاتے ہیں۔

ان سب فوائد کے حصول کے لئے ضروریات فقط ایک ایسے بلند اور پاکیزہ ضابطۂ حیات کی ہے، جسے سامنے رکھنے سے بازار کے پست ذہنیت مسلمان میں اُلوالعزمی پیدا ہو جائے وہ اپنے تئیں دُنیا کے مقدس ترین اُصولوں کا محافظ خیال کرنے لگے۔ اس کے اندر اعتمادِ نفس پیدا

ہو جائے۔ جب اپنی نفسانی خواہشات کو قربان کرنے کا موقع ہو تو اُس کے سامنے ایک مقصد ہو جس کے لئے اُسے یہ قربانی پُر معنی نظر آنے لگے۔ قاعدہ ہے جب کسی کے سامنے ایک مشن ہو تو وہ اپنے اندر ایک نئی طاقت محسوس کرنے لگتا ہے۔ میں نے غلط کہا وہی پرانی طاقتیں جو بوسیدہ ہو کر منتشر ہو رہی تھیں اب اُن میں اُمید کے بیج سے ایک نیا نخلِ استقلال پیدا ہو جاتا ہے۔ غرض اسلامی ضابطہ حیات خود اپنے لئے طاقتِ عمل پیدا کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔

اگر پوچھا جائے مردِ خدا قوم کو یہ سب باتیں منوانے میں کیونکر کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ مردِ خدا پہلے کسی دوسرے مردِ خدا کی نظر یا توجہ سے متاثر ہو کر قوم کے مصائب، اس کی ضروریات اور گزشتہ تاریخ پر اشد غور کرتا ہے۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ اس غور و خوض کے بعد وہ ایک لائحہ عمل تیار کرتا ہے۔ قوم کے سامنے اپنی غور و فکر کے نتیجے پیش کرنے سے پہلے وہ خود اپنی زندگی کو اپنے پیش کردہ ضابطۂ حیات کا نمونہ بناتا ہے۔ پھر جب وہ قوم کے سامنے آتا ہے تو اس غور و خوض کے باعث اُسے قوم کی فطرت پر ایسا گہرا عبور ہوتا ہے۔ اس کے خلوص کے سبب اس کی زبان میں یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے دلوں کے اندر اُتر جاتا ہے۔ وہ جسے ملتا ہے اسی کو اپنا کر لیتا ہے۔

مردِ خدا کی تلاش کیسے کی جائے:۔

مردِ خدا کی تلاش کا طریقہ یہ ہے کہ قوم کے جن جن افراد کو یہ شوق ہو وہ قوم کی روایات اور اس کے حالات پر غور کرنا شروع کر دیں۔ اگر ان میں خلوص ہے تو چاہے ان کے راستے مختلف ہوں وہ کم و بیش ایک ہی نتیجہ پر پہنچیں گے۔ کیونکہ قدرت کے حقائق جن پر غور کرنا ہے آخر وہ تو ایک ہی ہیں۔ پھر ان میں سے جس نے زیادہ غور کی ہوگی، جس کو فطرت نے زیادہ استعداد دی ہوگی وہ اپنے طور طریقوں سے خود بخود رہنما بن کر دوسروں کو مقتدی کر لے گا۔

مردِ خدا پر عقیدہ قوم کے اعتمادِ نفسی کو تو اپاہج نہ کر دیگا؟:۔

کسی کو مغالطہ ہو سکتا ہے کہ مردِ خدا پر یقین، عقیدۂ مہدویت کی طرح کہیں قوم کو بے عملی کی نیند نہ سُلا دے۔ لیکن ہمارا مردِ خدا کہیں باہر سے نہیں آتا بلکہ اُسے تو خود قوم نے پیدا کرنا ہے۔ ہم اس لئے مردِ خدا کے خواہاں نہیں کہ وہ ہم سب کے حصّے کا کام کر دے اور ہم مزے سے مامچھیاں اُڑاتے رہیں یا لمبی تان کر سو رہیں۔ بلکہ ہمارا مردِ خدا تو اس لئے ہوگا کہ نہ خود سوئے اور نہ دوسروں کو سونے دے۔ وہ اس لئے نہیں آئے گا کہ باقی قوم کو مفلوج اور اپاہج بنا دے بلکہ وہ

اس لئے آئے گا کہ ہر مسلمان اپنے اپنے حلقہ میں ایک مردِ خدا بن جائے۔ لہذا یہ عقیدہ بے عملی کا سبق دینے کے بجائے عین عمل کا پیغام دیتا ہے۔

کافر ہے تو ہے تابع تقدیرِ مُسلماں
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی!

توحید کا منبع مردِ خدا ہے:۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلامی ضابطۂ حیات کی بنیاد توحید پر ہے۔ آنکھ کی توحید، کان کی توحید، سونگھے ہوئے کی توحید، چکھے ہوئے کی توحید، محسوس کئے ہوئے کی توحید، چاہت کی توحید، عمل کی توحید، پھر ان سب توحیدوں کی توحید، یہی توحید کا انوکھا امتیاز ہے جس کے بل پر اسلام نے دیگر تمام امتیازات ترک کر کے ایک نئے امتیاز پر ایک نئی اُمّت کی بنیاد رکھی۔ جو کچھ دیکھو علیحدہ علیحدہ مت دیکھو۔ سب کو اکٹھا کر کے دیکھو۔ جو کچھ سُنو جدا جدا نہ سُنو، اکٹھا کر کے سُنو۔ جو کچھ چاہو الگ الگ نہ چاہو، اکٹھا کر کے چاہو۔ جو کچھ کرو ایک دوسرے کے متضاد نہ کرو بلکہ کسی ایک نقطہ پر پہنچنے کی خاطر کرو۔ جب تم یوں اپنے آپ کو اکٹھا کر لو گے تو تم اپنے آپ کو پا لو گے۔ جب تم اپنے آپ کو پا لو گے تو تم اللہ کو پا لو گے۔ جب تم اللہ کو پا لو گے تو تم پاک ہو جاؤ گے۔ جب تم پاک ہو جاؤ گے تو تم جہاں رہو گے وہ پاکستان ہوگا۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن دُنیا کے تمام دوسرے اسباق کی طرح یہ سبق بھی تم بغیر کسی مردِ خدا کی توجہ کے نہیں سیکھ سکتے۔ مردِ خدا ہی توحید کا منبع ہے۔

☆/☆/☆/☆/☆

پاکستان بنے گا کیسے؟

تمہید:۔

پاکستان کے متعلق ہم اس وقت تک جو بحث کرتے رہے وہ نسبتاً آسان ہے۔ موجودہ فصل کا موضوع مقابلتاً مشکل ہے۔ اسلام کی بنائے وحدت توحید اور ایمان پر تھی۔ یہ وحدت ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں کن اسباب سے اور کس طرح منتشر ہوئی۔ پھر اس وحدت کے بچے کھچے آثار کیوں کسی دوسری ہمسایہ وحدت نے جذب نہ کر لئے۔ دوسری ملکی وحدتوں نے کس طرح ان باقی ماندہ آثار کو علیحدہ دھکیل دھکیل کر پھر انہیں اُن کے جدا ہونے کا احساس کرا دیا۔ اب یہ نووارد وحدت کیسے اپنی فراموش کردہ توحید یاد کر رہی ہے۔ اس مجوزہ پاکستان میں ہم کیا نقشہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ سب ایسی باتیں ہیں جو ہو چکی ہیں یا ہم چاہتے ہیں کہ ہو جائیں۔ ماضی کی کہانی اور مستقبل کا تخیل دونوں پیش کرنے میں کچھ ہینگ پھٹکڑی تو لگتی نہیں۔ ایک تذکرہ ہے بیان کر دیا۔ لیکن خواب دیکھنے کے بعد اُسے حقیقت کا جامعہ پہنانا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔ تیر کمان پر بھی ہاتھ رہے، نشانہ بھی نظر سے اوجھل نہ ہونے پائے اور ہوا کے جھونکوں کا بھی خیال رہے جو تیر کو کدھر سے کدھر لے جایا کرتے ہیں۔ ایسی تیر اندازی بچوں کا کھیل تو نہیں اس کے متعلق پہلے سے کیسے متعین کیا جا سکتا ہے کہ کب تیر چھوڑا جائے گا اس وقت ہواؤں کا رُخ کیا ہوگا اور اس کا تدارک کیسے کیا جائے گا۔

"لائحہ عمل" لکھ کر بیان نہیں کئے جایا کرتے:۔

علاوہ ازیں "لائحہ عمل" لکھ کر پیش نہیں کیا جاتا۔ "لکھ کر" عقیدے ہی پیش کئے جاتے ہیں۔ عمل کا فیصلہ قدم بقدم کیا جاتا ہے۔ عمل کے متعلق کچھ لکھ کر پیش بھی کیا جائے تو وہ عقیدہ ہی ہوگا۔ جب تک وہ ہو نہ جائے عمل تو کہلا ہی نہیں سکتا۔ اس طرح ایک طرف عقائد میں غیر ضروری تفصیل شامل ہو جانے کا خدشہ رہتا ہے۔ دوسرے عمل میں لچک نہ رہنے کا خطرہ بھی ہے۔

عمل کا راستہ بتا دینے سے اس کا مطلب فوت ہو جانے کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ قوم کو فقط عقیدہ بتانا چاہیے۔ عمل کا راستہ لیڈر ہی کے دماغ میں محفوظ رہنا چاہئے۔ جہاں وہ اس میں حسبِ ضرورت اور مناسبِ وقت ترمیم کر سکے۔ عقیدہ دوست دشمن سب کو بتایا جا سکتا ہے کیونکہ ہم سب کو اس کی دعوت دیتے اور تلقین کرتے ہیں۔ لیکن اپنا حیلۂ جنگ، اپنا عمل مخفی ہی رہے

تو اس کا اثر ہے۔ سفر سے پہلے فقط منزل ہی کا پتہ بتایا جا سکتا ہے۔ راستہ میں کون کون سی راہ اختیار کی جائے، دشمن کو کس کس موڑ پر چکمہ دیا جائے، یہ کیا پہلے سے بتا دینے کی باتیں ہیں؟ ان کا فیصلہ تو سالارِ کارواں ہی کرے گا اور وہ بھی وقت آنے سے پہلے نہیں۔

عقائدِ عمل:۔

ہر ضابطہ حیات سے متعلق عقائد دو نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اوّل وہ اٹل اور بنیادی اصول جن کی بنیاد حقائق قدرت پر ہوتی ہے۔ جو اس ضابطۂ حیات کی اصل و اساس ہوتے ہیں۔ صحیح معنوں میں عقیدہ کے لفظ کا اطلاق انہیں اُصولوں پر ہو سکتا ہے۔ دوسرے زمانہ کی وقتی روش کے متعلق مشاہدہ، تجربہ اور مطالعہ سے اخذ کردہ نتائج جنہیں عقیدہ کا رتبہ نہیں دیا جا سکتا۔ ان کی بنیاد معاصرین کی نفسیات، ہمسائیوں کی عادات اور خواہشات اور حریفوں کی خصوصیات پر ہوتی ہے جو ہمیشہ بدل سکنے والی چیزیں ہیں۔ زمانے زمانے کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ ان عارضی عقائد کو ہم عقائدِ عمل کا نام دیتے ہیں۔ تیسری چیز لائحہ عمل ہے جو عقائد اور عقائدِ عمل کی روشنی میں روز مرہ کے حادثاتِ عالم کا اندازہ کر کے اُن سے یوں نپٹنے کا نام ہے کہ اُن کی روش زیادہ سے زیادہ ہماری مرضی کے مطابق ہو جائے۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ لائحہ عمل میں کوئی ایسی مستقل شاہراہ نہیں جس کا ذکر سیاہ و سفید میں ہو سکے۔ اس میں بہت کچھ وقتی حالات اور کرنے والے کی شخصیت پر منحصر ہے۔ ہم نے یہ بھی بتایا ہے کہ اُصولی پروگرام تو کھول کر بیان کرنے سے کامیابی ہوتی ہے لیکن عملی پروگرام کا اثر اس کے پوشیدہ رکھنے میں ہے۔ مزید برآں عمل کی تحریک زبان سے پھر تھوڑی بہت ممکن ہے۔ لیکن قلم اس میدان میں کوئی اچھا ذریعۂ اظہار نہیں۔

تاہم عقائدِ عمل کے متعلق لکھ کر بھی کچھ بیان کیا جا سکتا ہے اور وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

ہم چاہتے کیا ہیں؟

عقائدِ عمل طے کرنے سے پہلے ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ ہم چاہتے کیا ہیں؟ تب یہ دیکھنا ہوگا کہ جو کچھ ہم چاہتے ہیں موجودہ صورتِ حالات میں کیا کچھ اس کے مطابق ہے اور کیا اُس سے مختلف۔ جو مختلف ہے اُس کا وجود کن حقائق و اسباب پر مبنی ہے۔ اس کے بعد یہ دریافت کرنا ہوگا کہ اُن اسباب و حقائق کو کیسے برہم کیا جا سکتا ہے۔ آخری مرحلہ یہ ہوگا کہ آیا موجودہ ناپسندیدہ

حالات جن اسباب وحقائق پر مبنی ہیں محض ان کو برہم کرنے سے پیدا شدہ صورت حالات ہماری پسند کے مطابق بن جائے گی یا اس میں پھر تغیر وتبدل درکار ہوگا۔ اگر پہلی صورت ہے تو فبہا ورنہ بصورت دیگر موجودہ ناپسندیدہ حقائق واسباب کو برہم کرنے میں اس ثانوی تغیر وتبدل کا بھی خیال رکھ لینا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔

یہ ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا تمام مدارج طے کرنے کے بعد بھی ہم نے ابھی عقائدِ عمل ہی طے کئے ہوں گے۔ عمل بجائے خود اس سے بھی ایک قدم آگے ہے۔ نپولین نے کہا تھا: ''میدانِ جنگ کا نقشہ ہر احمق تیار کرسکتا ہے لیکن اس پر کامیاب عمل کی خاطر کسی جرنیل کی ضرورت ہوتی ہے''۔

I:۔ اچھا تو پہلے یہ دیکھیں ہم چاہتے کیا ہیں؟ منفی طور سے ہمیں اپنی موجودہ پستی، ذلت، بیچارگی، مُفلسی، بیماری اور دوسروں کی دست نگری اور نقالی قبول نہیں۔ واہ! یہ بھی کوئی بات ہے کہ سمندری ساحل پر نمک لگا کر کچی مچھلیاں چبانے والے مچھیروں کی اولاد تو ہندوستان کی شہنشاہت پر قابض ہو، ہمارے عساکر میں جھاڑی لگا کر گلے کے چنے بیچنے والے بہیوں بقال کی نسل ٹاٹا برلا بن جائے اور پلاؤ قورمہ کھانے والے، جبہ وعمامہ پہننے والے، مسند پر بیٹھنے والے، سلطنتِ ہندوستان اور خلافتِ مشرق ومغرب کا مالک مسلمان روٹی کے سوکھے ٹکڑے، ستر ڈھانکنے کو کپڑے کے لئے اور سر چھپانے کیلئے جھونپڑے کو ترسے؟ پھر ستم بالائے ستم کہ یہ کمینے نو دولتے ہماری حالت پر ہنسیں۔ ہمیں چوکے دے کر ہم پر قہقہے لگائیں۔ ہماری غیرت اور ضرورت دونوں مصمم ہیں کہ ہم اس صورت حالات کو بدل ڈالیں گے۔ مسلمانانِ ہندوستان کو اِن کا موجودہ مقدر منظور نہیں۔

مثبت طور پر ہم جانتے ہیں کہ کائنات کے رازِ توحید کا حامل ہونے کی حیثیت میں اس گئی گذری حالت میں بھی ہم خیرالامم ہیں۔ صراطِ مستقیم سے بھٹکی ہوئی انسانیت کو صرف اسلام ہی مشعلِ ہدایت دکھا سکتا ہے۔ صرف ہمارا تمدن ہی عالمگیر تمدن بن سکتا ہے۔ صرف ہماری شریعت ہی عالمگیر عدالت قائم کرسکتی ہے۔ صرف توحید ہی موجودہ فلسفہ اور نفسیات کی گتھیاں سلجھا سکتی ہے۔ ہماری یہی برتری ہمیں تسخیر عالم کا حق دیتی ہے اور اسی کی وجہ سے ہم پر خلافت کا فرض عائد ہوتا ہے۔

گویا ہم ہندوستان میں اسلام کا ایک دینی، تمدنی، سیاسی اور جنگی مرکز قائم کرنا چاہتے ہیں جہاں رُوحانی، اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی، فوجی، نفسیاتی غرض ہر قسم کی قوت نفاذ کے مالک ہم اور صرف ہم ہوں۔ اس پاکستان سے ہم بنی نوع آدم کو ہدایت کا راستہ دکھائیں گے۔

II:۔ یہ تو پتہ چل گیا کہ ہماری خواہش کیا ہے۔ اچھا اب یہ دیکھیں کہ صورت حالات میں اس کے ناموافق پہلو کیا ہیں۔

(۱) اوّل سب سے بڑی رکاوٹ تو یہ ہے کہ منفی اور مثبت دونوں لحاظ سے ہماری چاہت خام ہے۔ نہ ہم ابھی اپنی ذلت اور بیچارگی سے پورے طور پر متنفر ہیں اور نہ ہی ہم ابھی اپنی عزت اور اقتدار کے پورے خواہاں ہیں۔ جو چند لوگ نفی اثبات کی اس کسوٹی پر پورے اُترتے ہیں، اُنہوں نے ابھی تک اپنی موہوم تمنا کی جزئیات ہی طے نہیں کیں۔ کہیں دماغی طور پر جزئیات بھی طے ہو چکی ہوں تو اُن کو ایک مرتب نظام میں نہیں لایا گیا۔

(۲) دوسری دقت یہ ہے کہ گو ہماری رُوحانی، نفسیاتی، اخلاقی اور معاشرتی مرکزیت کا کوئی دوسرا حریف آج اور اس وقت بھی ہندوستان میں موجود نہیں لیکن مُصیبت یہ ہے کہ عوام کے سامنے جب تک رُوحانیت، نفسیات، اخلاقیات اور معاشرت کے ہراول میں اقتصادیات، سیاسیات اور پولیس اور فوج نہ ہوں تب تک وہ کچھ بھی نہیں دیکھ سکتے۔

(۳) تیسرے: جسمانی قوتِ نفاذ کے میدان میں فرنگی کی پولیس، دفتری حکومت اور فوج ایک ایسی قوت ہے جس کا جواب ہندوستان کے کسی ملکی گروہ کے پاس نہیں۔

(۴) چوتھے: سیاسیات اور اقتصادیات میں خود فرنگی، پھر بنیا برہمن اور تیسرے درجہ پر ان کے جلو میں چلنے والے گروہ ہم سے کہیں زیادہ طاقتور ہیں۔

(۵) پانچویں: ہندوستان کی کوئی ہمسایہ طاقت یا دُنیا کی کوئی بڑی طاقت ایسی نہیں جس کا فلسفۂ حیات ہم سے اِتنا قریب ہو کہ اس سے مدد کی توقع کی جاسکے۔

III:۔ رُکاوٹیں دیکھ لیں۔ اب یہ غور کریں کہ موافق پہلو کون سے ہیں۔ اس رسالہ کے سرورق پر ایک نقشہ دکھایا گیا ہے۔ اس نقشہ میں جو علاقہ خلافتِ پاکستان کی سلطنت میں شامل ہے وہاں کم وبیش ساڑھے سات کروڑ مُسلمان آباد ہیں۔ یہ تعداد ہمارے حق میں خاصی وزنی دلیل ہے۔ گو کسی ضابطۂ حیات کو عائد اور مروّج کرنے کے لئے محض اُس کے ماننے والوں کی تعداد کوئی قطعی یا فیصلہ کن دلیل نہیں۔ تاہم بالآخر تمام جسمانی اور رُوحانی طاقت کا منبع انسان ہے اور انسانوں کی اتنی بڑی تعداد کا ہمارا ہم خیال ہونا کوئی معمولی بات نہیں۔

دوسرے یہ سات کروڑ انسان جس علاقہ پر قابض ہیں وہ جغرافیائی لحاظ سے دُنیا میں اپنی نظیر آپ ہے۔ کشمیر کی وادیاں اور پہاڑ اور جنگلات اور معدنیات دُنیا کی سب سے بڑی جنگی صنعت کی کارخانہ گاہ بن سکتے ہیں۔ دریائے سندھ، پنجاب کے دریا اور گنگا اور برہم پتر دُنیا کے

بڑے سے بڑے برقی قوت پیدا کرنے والے اسٹیشنوں کو مات کر سکتے ہیں۔ پنجاب میں کوہستانِ نمک سے دُنیا کی سب سے بڑی کیمیاوی صنعت قائم کی جا سکتی ہے جہاں نمک سے ہر کیمیاوی مرکب تیار ہو سکے گا۔ کلکتہ اور کراچی کی بندرگاہیں دُنیا کے ہر کونے سے ہمارا بحری رشتہ قائم کر دیں گی۔ اطاعت کیش کشمیری ہمارے کارخانوں میں دُنیا کا بہترین مزدور ہوگا۔ پنجاب کا جاٹ اور راجپوت، سرحد کا پٹھان اور بلوچستان کا بلوچ دُنیا کے بہترین سپاہی ثابت ہوں گے۔ لاہور اور امرتسر کے لوہار اور بڑھئی تربیت پا کر سائنس اور مشین کے بہترین مُوجد ثابت ہونے کی استعداد رکھتے ہیں۔ گیہوں اور کپاس کو پہاڑوں پر چرنے والی بھیڑ بکریاں، میدانوں کی مٹی اور ریگستان کی ریت ہماری صنعت اور تجارت کو دُنیا کی منڈیوں پر غالب کر سکتے ہیں۔

تیسرے سب سے بڑی بات یہ کہ ہماری سرحدیں محفوظ ہیں۔ جغرافیہ نے ہمیں کوہستانی فصیلیں دی ہیں۔ سیاسی طور پر سوائے رُوس کے ہمارا کوئی ہمسایہ ہم پر حملہ کی جرأت نہیں کر سکتا اور اگر ہم اپنے ہم عقیدہ لوگوں میں بڑھنا چاہیں تو وسطِ ایشیاء کی پہنائیاں، عراق، عرب، مصر، طرابلس اور الجیریا اور نہ جانے کدھر کدھر ہمارے ہم مذہب ایک مسلسل راستہ کی طرح ہمارے سامنے پھیلے ہیں۔

چوتھے ہمارا ضابطۂ حیات اور نظامِ مُعاشرت چین، ہندوستان اور رُوس تینوں کے بوسیدہ مذاہب سے زیادہ ترقی پسند اور بہتر ہے۔ ہمارا وجود ہی ان کو ایک چیلنج ہے۔

پانچویں ہماری اصلاحی تحریک تاریخ کے ایک ایسے مرحلے پر اُٹھ رہی ہے، جب جاپان کے بعد ایشیاء کی سربلندی کی وکالت کرنے والی اور کوئی جوان طاقت نہیں۔ رُوس کی ذہنیت مشرقی نہیں مغربی ہے۔ پھر اس کا انقلاب ہمارے انقلاب کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔

IV:۔ اپنی جاہت بھی متعین کر لی، بڑے پیمانے پر اس کے مخالف اور موافق عناصر بھی شمار کر لئے۔ اب سوال یہ ہے کہ ناموافق طاقتوں کی تہ میں کیا اسباب وحقائق ہیں اور اُن کو کیسے بر ہم کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے ناموافق صورتِ حالات کی بُنیاد دو قسم کے حقائق واسباب پر ہے۔ اوّل ہماری ساری بہتری اور تفوق ہمارے ممکنات پر انحصار رکھتے ہیں۔ ورنہ ہماری موجودہ کیفیت تو یہ ہے کہ ہم اپنے آپ میں ہی نہیں۔ ہم نے خود کو نہیں پہچانا تو کوئی ہمیں کیا پہچانے۔ ہم اپنے ضابطۂ حیات اور توحید سے برگشتہ ہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ ہم اپنی شامتِ اعمال سے توبہ کر کے رُوحانی، اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی، جسمانی، سیاسی اور جنگی طور پر مسلمان بن جائیں۔

دوسرے حالات کی ناسعدت ہمارے مخالفین کی جنگی، انتظامی اور اقتصادی طاقت کی وجہ سے ہے۔ ہندوستان میں مسلمان دشمن تو تین ہیں۔ اوّل نواب اور شریعت فروش، دوسرے بنیا برہمن اور تیسرے فرنگی اور بابو۔ بنیا برہمن اور شریعت فروش اور نواب تو محض ہم پر اقتصادی غلبہ رکھتے ہیں ورنہ اخلاقی یا جنگی طور پر وہ ہم سے قطعاً بہتر نہیں۔ فرنگی جنگی اور انتظامی برتری کا مالک ہے اور بابو محض فرنگی کے کھونٹے پر ناچتا ہے۔

اب اگر غور سے دیکھیں تو ہمیں ہمارے مخالفین کی اقتصادی اور جنگی طاقت ہمارے تعاون کی مرہونِ منت ہے۔ اگر پاکستان کے علاقہ کے مسلمان اپنے آپ میں آجائیں اور فرنگی اور بنیا برہمن اور نواب سے مقابلہ نہ بھی کریں خالی اُن کی امداد سے ہی قطعاً دستکش ہو جائیں تو ان دونوں مخالفین کی اقتصادی اور جنگی طاقت فی الفور ناکارہ ہو جائے گی۔

لیکن یہ اقدام کاغذ پر جس قدر آسان نظر آتا ہے اتنا آسان نہیں۔ فرنگی اور بنیا برہمن اور نواب ہمارے مسلمانوں کو ورغلا کر ہم سے لڑا دیں گے اور ہمیں اُن کے خلاف متحد ہونے سے روکیں گے۔ یہاں ہمیں زبردست مقابلہ کرنا ہوگا۔

یہ تو ہوا موجودہ نظام کو توڑ کر اس کی جگہ اپنا نظام نافذ کرنے کا پروگرام۔ یہ بڑی ہمت اور حوصلہ کا کام ہے۔ موجودہ نظام پر یوں سامنے سے حملہ کرنے کے ساتھ کچھ لوگ اس نظام کو اندر سے کھوکھلا کرنے کی بھی ضرور کوشش کریں گے۔ کسی نظام کے اندر کام کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ تو اُسے ضرور قبول کرنا ہی پڑتا ہے، چاہے بالآخر اُسے تمام وکمال تباہ کر دینے کی ہی نیت ہو۔ اس میں بڑا خطرہ یہ رہتا ہے کہ کہیں بیچ بیچ اس ناٹک کا کوئی اثر ہماری شخصیت پر نہ رہ جائے۔ بعض لوگ دراصل کسی ملعون نظام کو قبول کر کے اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں اور اُسے نام دے لیتے ہیں اس نظام کا ''اندر سے مقابلہ کرنے کا''۔ یہ شکست خوردہ ذہنیت کے پست ہمت لوگ ہوتے ہیں۔

حصولِ مقصد کا ذریعہ:۔

اس وقت تک ہندوستان میں پاکستان کی تحریک نے اپنے مخالفین کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کر رکھا ہے کہ زمانہ کا رُخ دیکھ کر اپنے مقاصد کو ''جمہوریت'' اور ''حقِ استقلال'' کا رنگ دے لیا ہے۔ حُسنِ اتفاق سے کانگرس کے مطالبوں سے تنگ آئے ہوئے فرنگی کی جنگی قوت، مصلحت اسی میں سمجھتی ہے کہ ہمارے مطالبات کو کانگرس کے مطالبات کے مساوی قرار دے کر

دونوں کو ناکارہ بنائے رکھے۔ یوں ہم خود آگے نہیں بڑھ سکتے تو کم از کم ہماری وجہ سے بنیا برہمن بھی تو ساتھ ہی رُکا پڑا ہے۔ اس تعطل میں دو بڑے نقائص ہیں۔ اوّل تو یہ کہ فرنگی کی جنگی اور انتظامی قوت جہاں چاہے (مثلاً پنجاب میں ہمیں زچ کر سکتی ہے) دوسرے بنیا برہمن بھی اگر یہی ضد کرے کہ چلو مجھے اکھنڈ ہندوستان نہیں ملتا تو کم از کم میں مسلم پاکستان کو بھی تو روکے بیٹھا ہوں تو اس صورت میں ہمارے مقاصد بہت دُور جا پڑتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ آئینی طریقۂ کار بہر صورت ایک خارجی طریقۂ کار ہے۔ اس سے ہماری نہ کچھ اصلاح ہوتی ہے نہ اپنے ہاتھ میں کوئی قوت آتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ میں آئینی طریق کار کی مذمت کر رہا ہوں۔ جب تک اور کوئی طریقۂ کار نہ تھا یہ واحد طریقۂ کار تھا اور محض اس کی برائیاں گنوا دینے سے کچھ ثابت نہیں ہوتا جب تک ہم کوئی دوسرا طریقہ بھی ساتھ ہی تجویز نہ کر سکیں۔

ایمانی طریقۂ کار:۔

یہ دوسرا طریقۂ کار ایمانی ہے۔ دوسرا ان معنوں میں نہیں کہ اس میں آئینی طریقۂ کار نظر انداز کر دیا جاتا ہے بلکہ ان معنوں میں کہ آئینی طریقۂ کار محض خارجی حالات کو خارجی علاج سے دُور کرنے کی کوشش ہے۔ برعکس اس کے ایمانی طریقۂ کار داخلی اور انقلابی ہے۔ ہم آئینی طریقۂ کار بھی اختیار کریں تو اس کا تعلق ہماری زندگی کی عمیق ترین سعی سے ہوگا۔

ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ پاکستان ہمارے نزدیک محض کسی زمین کی تقسیم یا آئین کی منظوری کا نام نہیں بلکہ یہ ایک تحریک ہے اسلامی ضابطۂ حیات کے نفاذ کی خاطر اور اس کا سرچشمہ مسلمان کی خود اپنی اسلامی سرشت ہے۔ ایسا پاکستان بنانے کا طریقۂ کار بھی اس کی بنیادی فطرت سے جدا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اگر پاکستان کی بنا توحید ہے تو ہمارے طریقۂ کار کی بنا ایمان ہوگا۔

ہم ناسازگار ماحول کو تبدیل کرنے کے لئے پہلے قوم کو تبدیل کریں گے۔ ہم اپنی بدبختی اور ذلت کے اسباب خود اپنے عقائد کی پریشانی میں تلاش کریں گے۔ ہم غیروں کی بے توجہی کا گلہ اور شکوہ کرنے یا رحم و انصاف کی درخواستیں کرنے کے بجائے ان مظالم کو دُور کرنے کی طاقت پیدا کریں گے۔ ہم اپنے مصائب اور ذلتوں کو ریزولیشنوں، نوحوں اور مرثیوں میں مشتہر کرانے کی بجائے ورد ہی کو درماں ڈھونڈنے کا ذریعہ بنائیں گے۔

ہمیں گاندھیانہ عدم تشدد پر ذرہ بھر اعتماد نہیں۔ ہم فرنگی کے مواعید اور آئینی ترقی کی طفل تسلیوں کو پرکاہ جتنی وقعت نہیں دیتے۔ ہم جانتے ہیں کہ بنیا برہمن اقتصادی قوت کے بل پر

اکڑ رہا ہے اور فرنگی کو اپنی جنگی اور انتظامی برتری پر ناز ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ دُنیا میں ہر ترقی، غلبہ اور اقتدار کا انحصار طاقت اور قوت پر ہے۔ چاہے یہ طاقت اخلاق ہو چاہے جسمانی اور چاہے اقتصادی۔ ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ طاقت کی یہ تینوں صورتیں قوتِ ارادی پر منحصر ہیں۔ قوتِ ارادی کا رُخ سیدھا ہے تو وہ قوت ایمانی بھی ہے اور اگر ارادہ کا رُخ گمراہ ہے تو وہ بے ایمانی کی طاقت ہے۔ ارادہ کا سیدھا رُخ وہ ہے جو توحید پر مبنی ہو۔ جو زندگی کو ایک اکائی سے شروع کرے اور اکائی پر ہی ختم کرے۔ جو ارادہ زندگی کے مختلف ٹکڑے کر کے انہیں متضاد یا قائم بالذات اُصولوں پر چلائے وہ شرک ہے۔ غرض ارادہ کو ایمان کی سچائی اور گہرائی توحید سے حاصل ہوتی ہے اور توحید کا راستہ دین ہی دکھا سکتا ہے۔ دین کا منبع صرف مردِ خدا کی ذات ہوتی ہے۔ محض عقل اور تجربہ گاڑی کے پہیے ہیں باگ ڈور نہیں۔

مسلمان بننا ہے تو اسلام اختیار کرو:۔

توحید اور ایمان کی بنا پر پاکستان کے قیام کی پہلی شرط یہ ہے کہ جو گروہ اس کوشش کا علمبردار ہو کر نکلے پہلے وہ خود اپنے عقائد اور نظامِ زندگی کو کتاب و سنّت کے سانچے میں ڈھالے۔ خلافتِ پاکستان پارٹی کا ایک چھوٹے نمونہ پر خلافت بننا لازمی ہے۔ مغرب کے لعنتی پارلیمنٹری طریقۂ کار میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنے بہترین مردِ خدا کو اپنا ناخدا مقرر کر لینا چاہیے اور جب تک قوم کوئی اس سے بہتر فرد پیدا نہ کر لے اس مقرر شدہ امیر کی پوری اطاعت کرنی چاہیے۔

ایسی جماعت کے پہلے دو بڑے فرائض داخلی تطہیر اور رابطۂ عوام کی تحریک ہوں گے۔ اوّل الذکر کے لئے یاد رکھنا چاہیے کہ مقلدین کے کردار کی اصلاح کا بہترین طریقہ امیر کی شخصی مثال ہے۔ موخر الذکر مقصد کی کامیابی جماعت کے کارکنوں کے کردار اور مقررین کی قوت بیان پر ہے۔ دُنیا کے تمام بڑے بڑے انقلابات خطابت کے زور سے چلائے جاتے رہے ہیں۔

قرآن مجید کی قرأت اور ترجمہ سنانا، لاؤڈ سپیکر کا استعمال، اسٹیج کی ترتیب، جماعت کے رضاکاروں کی ایک سی وردیاں اور جو کچھ اُن کو منہ سے سمجھایا جا چکا ہو اس کو قلم سے دماغ میں راسخ کر دینے والے پمفلٹ، یہ سب آلات رابطۂ عوام کے لئے استعمال کرنے چاہئیں۔

یہ لکھ کر بتانے کی ضرورت نہیں کہ جماعت کے امیر یا قائد کو کس طرح مختلف شہروں، گاؤں اور محلوں میں اپنے مراکز قائم کرنے کیلئے دورے کرنے چاہئیں۔ کس طرح اپنی شخصیت اور جماعت کی عظمت کی نمائش سے لوگوں کے دل موہ کر رفتہ رفتہ علاقہ کے تمام محکموں اور اداروں

پر قبضہ کر لینا چاہئے اور کس طرح اپنے پیروؤں کو ہر جگہ ایک مجاہدانہ تنظیم میں منظم کر لینا چاہئے۔ یہ باتیں خود اس کی فراست اور ذہانت اُسے مناسب موقعوں پر سلجھاتی رہیگی۔

جب جماعت کا ایمان اور قوت ایک خاص معیار حاصل کر لے تو بتدریج جس طرح ہم نے پہلے ایک دفعہ ہندوستان پر قبضہ کیا تھا اور جس طرح وہ ہم سے چھینا گیا تھا اسی طرح وہ ہمیں واپس بھی مل سکتا ہے۔ یاد رکھنا چاہئے آج مسلمان اور نیابتِ الٰہی اور تسلط فی الارض کے درمیان صرف خون، فولاد اور بارود کی ایک دیوار حائل ہے۔ اس دیوار کو ہم فقط توحید اور ایمان سے ہی توڑ سکتے ہیں۔

عملی پروگرام:۔

اب یہ تو خوب واضح ہو گیا کہ ہم پاکستان میں توحید اور ایمان کی بناء پر خلافتِ اسلامیہ قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی پتہ چلا کہ ہندوستان میں ہمارا کوئی ہمسایہ رُوحانی، اخلاقی، معاشرتی اور تمدنی طور پر ہماری اس آرزو کو روک نہیں سکتا۔ صرف دقت یہ ہے کہ فوجی اور اقتصادی و انتظامی طور پر فرنگی اور بنیا، برہمن اور شریعت فروش نواب ہمارے راستہ میں حائل ہیں۔ اس کا علاج ہم نے اوپر یہ تجویز کیا ہے کہ ہم ان دشمنوں سے اپیلیں کرنے یا اُن کے خبط اور توہمات اور رسوم جاہلانہ کی مطابقت سے اپنے حقوق ثابت کرنے کے بجائے خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہوتے ہیں اور ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ یہ فیصلہ تو بڑا دلیرانہ اور مبارک فیصلہ ہے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ ممکن بھی ہے۔ ہم کس طرح اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں گے؟ موجودہ نظام نظر انداز کیسے کیا جا سکتا ہے؟ موجودہ بے بسی اور لاچاری میں ان سب دشمنوں کا مقابلہ کیونکر ہوگا؟؟؟

V:۔ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لئے ہمیں پہلے اپنے دین کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ توحید کے کیا معنی ہیں، رسالت کا کیا مقام ہے، پانچ ارکانِ دین رُوحانی، اخلاقی، جسمانی، انفرادی اور جماعتی زاویہ نگاہ سے کیا نوعیت اور اہمیت رکھتے ہیں، شریعت کا زندگی میں کیا منصب ہے، فقہ میں کیا کچھ ہمیشہ رہنے والا ہے اور کیا وقت وقت اور زمانے زمانے کی ضرورت کے ساتھ بدل جانے والا۔ یوں جب ہم اُمتِ اسلامیہ کی بنائے تشکیل اور تشکیل سمجھ گئے تو ہم نے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا طریقہ دریافت کر لیا۔ اب صرف یہ باقی رہ جائے گا کہ ہم اس طریقہ پر عمل کرتے ہوئے خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں۔

دوسرا سوال ہے اقتصادی، انتظامی اور فوجی طور پر مخالفین کا مقابلہ کرنے اور انہیں زک

دینے کا۔ اس کے لئے ہمیں اپنے ضابطۂ حیات کی رعایت سے اس ملک کے حالات کا جائزہ لے کر یہاں اپنا مخصوص اقتصادی، انتظامی اور فوجی نظام کھڑا کرنا ہوگا۔ یہ نظام ایسے طریقہ سے کھڑا کرنا ہے کہ نہ تو فرنگی اور بنیا برہمن اور شریعت فروش نواب ہماری ترقی روک سکیں اور نہ ہی قبل از وقت، ان لوگوں سے ٹکرا کر ہماری پنپتی ہوئی طاقت کو نقصان پہنچے۔

نقشۂ آبادی سرزمین پاکستان

صوبہ/اقوام	مسلمان	ہندو	سکھ	اچھوت
کل آبادی				
کشمیر	۲۹۹۷۱۱۳	۶۹۳۰۱۱	۶۵۸۸۴	۱۱۳۴۶۴
صوبہ سرحد	۲۷۸۸۷۹۷	۱۸۰۳۳۱	۵۷۹۳۹	---
بلوچستان	۴۳۸۹۳۰	۳۱۵۳۱	۱۱۹۱۸	۵۱۰۴
سندھ	۳۲۰۸۳۲۵	۱۰۳۸۴۹۴	۳۱۰۱۱	۱۹۱۶۳۴
پنجاب	۱۶۲۱۷۲۴۲	۶۳۰۱۷۳۷	۸۷۵۷۴۰۱	۱۲۳۸۶۳۵
دہلی	۳۰۴۹۷۱	۳۳۳۵۳۴	۱۶۱۵۷	۱۲۲۶۹۳
آگرہ	۶۲۳۱۰۶۴	۲۵۸۸۹۸۵۷	۲۳۶۰۹۱	۸۰۱۸۸۰۳
اودھ	۲۱۸۵۳۳۶	۸۲۰۳۶۵۴	۶۳۳۹	۳۶۹۸۳۵۵
بہار	۳۱۶۸۳۷۰	۲۲۱۷۳۸۹۰	۳۳۰۴	۴۳۳۰۳۷۹
بنگال	۳۳۰۰۵۴۳۴	۱۷۶۸۰۰۵۴	۱۰۲۸۱	۷۳۷۸۹۷۰
آسام	۳۴۴۲۴۷۹	۳۵۳۶۹۳۴	۳۳۶۴	۶۰۶۴۹۱
میزان	ساڑھے سات کروڑ ۷۴۹۸۸۰۶۹	ساڑھے آٹھ کروڑ ۸۶۱۸۳۸۰۱	پانوے لاکھ ۹۱۹۵۷۰۲	اڑھائی کروڑ ۲۵۷۹۳۳۳۶
کل آبادی قریباً ساڑھے انیس کروڑ				

کل مردانہ آبادی

صوبہ/قوم	مسلمان	ہندو	سکھ	اچھوت
کشمیر	۵۸۶۲۹۳	۳۶۹۰۳۷	۳۳۷۶۴	۶۰۷۷۲
صوبہ سرحد	۱۳۹۹۸۰۶	۱۰۹۲۸۲	۳۳۶۳۱	---
بلوچستان	۲۲۷۸۳۸	۳۹۰۰۰	۹۱۳۲	۳۶۳۰
سندھ	۱۷۶۳۹۹۸	۷۱۰۶۵	۱۸۵۶۴	۱۰۳۹۶۷
پنجاب	۸۷۳۸۱۸۵	۳۳۵۰۵۸۲	۲۰۳۹۲۸۹	۶۶۲۰۱۹
دہلی	۱۷۶۴۷۷	۲۶۲۳۹۳	۱۰۳۹۹	۶۹۳۹۶
آگرہ	۳۲۹۶۱۸۲	۱۳۶۹۰۵۲۲	۱۳۶۳۶۲	۳۱۲۰۲۸۹
اودھ	۱۱۳۱۰۶۶	۴۲۹۷۱۰۹	۳۰۳۱	۱۸۹۹۹۷۹
بہار	۲۰۵۲۸۳۳	۱۱۲۰۷۸۹۱	۱۹۱۲	۲۱۳۳۰۵۸
بنگال	۱۷۱۸۰۵۶۳	۹۵۶۰۰۵۳	۱۱۳۶۹	۳۸۴۳۱۱۵
آسام	۱۸۱۵۶۱۳	۱۹۰۱۷۵۶	۲۴۴۳	۳۵۹۱۱۵
میزان	چار کروڑ ۳۹۴۸۸۸۶۳	ساڑھے چار کروڑ ۳۵۷۳۹۳۹۱	چوبیس لاکھ ۲۳۹۳۰۰۶	ایک کروڑ تیس لاکھ ۱۳۲۵۶۳۳۹

کل آبادی قریباً دس کروڑ

سرزمین پاکستان کی آبادی:۔

یہ دونوں مقاصد حاصل کرنے کا نقشۂ عمل تیار کرنے سے پہلے آیئے! ذرا سرزمین پاکستان کا کچھ جائزہ لیں۔ یہاں اپنی حالت پر غور کریں۔ تبھی تو نقشۂ عمل تیار کرنے کے قابل بن سکیں گے۔

صفحہ ۶۔۱، پر سرزمین پاکستان کے نقشۂ آبادی کو دیکھئے۔ یہاں سب قوموں اور تمام مذہبوں کو مل ملا کر قریباً ساڑھے انیس کروڑ مرد عورتیں اور بچے بستے ہیں۔ یہ اعداد و شمار ۱۹۴۱ء کی مردم شماری سے لئے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اعداد و شمار تخمینہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ قطعاً درست نہیں

کہے جا سکتے۔ لیکن ہمیں بھی تو ابھی محض ایک خاکۂ عمل تیار کرنا ہے۔ اس کیلئے یہ تخمینے کافی ہیں۔ بعد میں تفصیلی اعداد و شمار جماعت اور تحریک کو خود جمع کرنے ہوں گے۔

ہاں تو پاکستان کی اس ساڑھے انیس کروڑ کی کل آبادی میں سے تقریباً ساڑھے سات کروڑ مسلمان، مرد عورتیں اور بچے ہیں۔ باقی بارہ کروڑ کی آبادی میں ساڑھے چار کروڑ ہندو ذکور، چوبیس لاکھ سکھ ذکور اور ایک کروڑ تیس لاکھ اچھوت ذکور، کل قریباً چھ کروڑ غیر مسلم ذکور ہیں۔ بقیہ چھ کروڑ غیر مسلم اناث میں سے قریباً چار کروڑ ہندو اناث، اڑسٹھ لاکھ سکھ اناث اور ایک کروڑ اٹھارہ لاکھ اچھوت اناث ہیں۔

ان اعداد و شمار کا مقابلہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ سکھ ذکور میں سے ہر مذکر کے لئے ایک مونث چھوڑ کر پھر چالیس لاکھ سکھ اناث زائد بچتی ہیں۔ یہ چالیس لاکھ اناث پاکستانی علاقہ کی آبادی میں ایک زائد رقم ہیں اور اگر انہیں اسلامی آبادی میں شامل کر لیا جائے تو پاکستان کی مسلمان آبادی ساڑھے سات کروڑ سے قریباً آٹھ کروڑ بن جائے گی۔

ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دیکھئے کہ پاکستان میں اس وقت جو کل گیارہ کروڑ انیس لاکھ اچھوت اور ہندو مرد عورتیں اور بچے بستے ہیں۔ ان میں سے قریباً تین کروڑ اکتالیس لاکھ صوبہ آگرہ میں، قریباً ایک کروڑ انیس لاکھ صوبہ اودھ میں، اور قریباً دو کروڑ پینسٹھ لاکھ صوبہ بہار میں آباد ہیں۔ یہ وہ صوبے ہیں جن میں صرف پاکستان کے مشرقی اور مغربی اجزاء کو یکجا کرنے کی خاطر راستہ لیا گیا ہے۔ سارے صوبے اس وقت طلب نہیں کئے گئے۔ کچھ جنوبی اضلاع چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ آگرہ، اودھ اور بہار کی کل ہندو اور اچھوت آبادی سات کروڑ تیس لاکھ بنتی ہے۔ اگر ان سات کروڑ تیس لاکھ اچھوتوں اور ہندوؤں کو آگرہ، اودھ اور بہار کے شمالی پاکستانی اضلاع سے منتقل کر کے جنوبی غیر پاکستانی اضلاع میں ان کی نقل مکانی کر دی جائے اور وہاں کے مسلمان شمالی پاکستانی اضلاع میں لے آئیں تو یوں پاکستان میں ہندو اور اچھوت مرد عورتوں اور بچوں کی آبادی صرف چار کروڑ باقی رہ جائے گی۔ سارے پاکستان کی کل آبادی قریباً بارہ کروڑ اڑتیس لاکھ ہو گی جس میں ساڑھے سات کروڑ مسلمان تو اس وقت بھی کھرے موجود ہیں اور اگر زائد سکھ اناث کو اپنانے کی مذکورہ بالا تجویز پر عمل ہو سکے تو بارہ کروڑ اڑتیس لاکھ میں قریباً آٹھ کروڑ مسلمان ہوں گے اور صرف قریباً چار کروڑ چالیس لاکھ غیر مسلم۔

علاوہ ازیں مسلمانوں کی موجودہ ساڑھے سات کروڑ کی آبادی میں چار کروڑ ذکور ہیں اور صرف ساڑھے تین کروڑ اناث۔ گویا ایک مسلمان مذکر کے لئے صرف ایک مونث چھوڑ کر بھی

پچاس لاکھ اناث کی کمی ہے۔ حالانکہ ایک مسلمان مذکر بیک وقت چار بیویاں کر سکتا ہے اور یوں اصولاً مسلمان گھرانوں میں آج قریباً ساڑھے بارہ کروڑ مزید اناث کی کھپت ہو سکتی ہے۔ مسلمان اگر تجارت اور سیاحت کے متعلق اپنی پرانی روایات تازہ کریں تو دُنیا کے کئی ایسے حصے ہیں جہاں زائد رقم اناث موجود ہیں اور بآسانی دستیاب ہو سکتی ہیں۔ پاکستان کی زرخیز سرزمین اس ساری مزید آبادی اور اُن کی اولاد کی ضروریات کی کفیل ہو سکتی ہے۔

اگر یہ مقدار بھی پوری ہو جائے تو پاکستان کی آبادی قریباً ساڑھے چوبیس کروڑ ہو گی جس میں بیس کروڑ مسلمان ہوں گے اور صرف ساڑھے چار کروڑ غیر مسلم۔

بہرحال مسلمانوں کے ہاں پردہ کی رسم کے باعث اور اس لئے بھی کہ یہاں پچاس لاکھ اناث کی تو ایک بیوی کے حساب سے بھی کمی ہے، ہمارے گھر محفوظ ہیں۔

مندرجہ بالا اعداد و شمار میں مرد، عورت، بوڑھے بچے، تندرست اور بیمار سب شامل ہیں۔ اسلئے ان پر محض اندازے اور تخمینے کے طور پر انحصار کیا جا سکتا ہے کہ ذرا سی ہمت، یقین، فراست اور جوڑ توڑ سے کام لیا جائے تو کیا شاندار نتائج پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ یہ نہیں کہ ایک ایک اکائی درست ہوتی۔

تحریک اور جماعت :۔

اوپر ہم دیکھ چکے ہیں کہ تحریک پاکستان کے اصول کیا ہیں۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ ان اصولوں کی بناء پر جماعت بندی کیسے کی جائے۔ جماعت بندی کے بعد پھر مخالفین سے مقابلہ کی تحریک ہو گی۔ مخالفین کو زک دے کر جماعت اور مضبوط ہو گی۔ اس مضبوط جماعت بندی سے پھر تسخیرِ عالم کا سلسلہ شروع کیا جائے گا اور یوں یہ تسلسل ہمیشہ جاری رہے گا۔

ابھی ہم نے دیکھا کہ سرزمین پاکستان میں مسلمان ذکور کی موجودہ تعداد چار کروڑ ہے اس میں سے دو کروڑ بچے اور ایک کروڑ بوڑھوں اور بیماروں کا اندازہ کیا جائے تو باقی کم از کم ایک کروڑ ایسے تومند تندرست جوان ہوں گے جن کی عمریں پندرہ اور پینتیس برس کے درمیان ہیں۔ یہ لوگ پاکستان کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔

ان کے مقابلہ میں اسی ایک چوتھائی کے حساب سے بارہ لاکھ سکھ جوان ہوں گے اور ایک کروڑ دس لاکھ ہندو جوان۔ اچھوت جوان تینتیس لاکھ ہوں گے۔

اگر ہمارے پیشِ نظر محض اسلامی ضابطۂ حیات کا نفاذ ہو اور ہم مذہبی تعصب اور خبط

میں گرفتار نہ ہوں تو ہندوؤں کے مقابلہ میں سکھوں اور اچھوتوں دونوں کو ہم زیادہ کشش کر سکتے ہیں۔ اور اگر ہندو، سکھ اور اچھوت سارے ہی غیر مسلم مل کر ہمارے مقابلہ پر ایک جتھا ہو کر آ جائیں جس کی بظاہر کوئی وجہ نہیں اور سوائے ہماری حماقت کے ان سب کو ہمارے خلاف جمع کرنے کی اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، تب بھی ایک کروڑ مسلمان سے ڈیڑھ کروڑ نامسلمانوں کا مقابلہ ہے جو کوئی مایوس کن معرکہ نہیں۔ مسلمان دس کے مقابلہ میں ایک ہو پھر بھی اُسے فتح کی قرآنی بشارت ہے۔ یہاں تو فقط ایک کا ڈیڑھ سے مقابلہ ہے۔ پھر ڈیڑھ میں تین رقیبیں شامل ہیں۔ اور ایک کی وحدت میں کوئی دراڑ نہیں۔

مگر یہ سب تب کی باتیں ہیں جب ایک کروڑ جتھا بند ہو چکے ہوں۔ ان کا گھریلو محاذ بن چکا ہو۔ ورنہ اس وقت تو یہ آسام سے لے کر بلوچستان تک بکھرے پڑے ہیں اور ایک دوسرے کی خبر بھی نہیں۔ یہ کام انہوں نے خود ہی کرنا ہے۔ دوسرا انہیں روک سکتا ہے نہ کچھ مدد دے گا۔

VI :۔ اب تین باتیں دیکھنا ہے اوّل فرنگی کی موجودگی میں یہ انوکھا معرکہ شروع کیسے کیا جائے۔ دوسرے اپنی توحید کس طرح واپس لائی جائے۔ تیسرے اقتصادی، انتظامی اور فوجی جماعت بندی کیونکر سرانجام دی جائے۔

لو! اب ایک ایک کر کے سنو!

فرنگی یا بنیا برہمن ہمارا اوّلین دشمن نہیں پہلے ہمیں اپنا گھر ٹھیک کرنا ہے :۔

ہندوستان میں اقتصادیات، انتظامِ سلطنت اور فوجی اقتدار کا موجودہ ڈھانچہ فرنگی کے بل بوتے پر کھڑا ہے۔ لیکن ہم کسی موجودہ نظام سے ٹکرانے سے قبل اپنا علیحدہ نظام کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ہمیں سب سے پہلے اپنا ضابطۂ حیات سمجھنا ہے۔ پھر اس ضابطۂ حیات کو اختیار کرنا ہے۔ اس کے بعد داخلی دشمنوں شریعت فروش بابو، نواب اور اینگلو محمڈن سے نپٹنا ہے۔ اس کے بعد دو مرحلہ آئے گا جب بنیے برہمن یا فرنگی دونوں میں سے ایک کے ساتھ مل کر ہمیں دوسرے کا قلع قمع کرنا ہو گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم باری باری ان دونوں سے اَدل بدل کر معاہدے کریں اور یوں اپنی ترقی کا سامان کریں بہرحال شروع میں فرنگی یا بنیے برہمن سے ٹکرانا ہرگز ہمارا مقصد نہیں۔

اسلامیانِ ہند کی دینی تنظیم :۔

دراصل کسی ضابطۂ حیات کی بنا پر کسی گروہ کی تنظیم کے تمام پہلو ایک دوسرے سے

متعلق ہوتے ہیں۔ زندگی کے رُوحانی، اخلاقی، معاشرتی، تمدنی، اقتصادی، نسلی اور جسمانی شعبے علیحدہ علیحدہ ہوتے ہوئے بھی ایک وحدت ہیں۔ ان کا ایک دوسرے پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ یہاں ہم محض دینی اور اخلاقی تنظیم پہلے لیتے ہیں۔ مگر یہ واضح ہے کہ دینی اور اخلاقی ترقی، معاشرتی، تمدنی اور اقتصادی حالات کی سازگاری کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ مثلاً اقتصادی فارغ البالی نہ ہو تو فراغت نہیں ملتی۔ فراغت کے بغیر اطمینان کہاں میسر۔ اور اطمینان نہ ہو تو توجہ کیسے مرکوز رہے۔ ظاہر ہے بغیر توجہ کے نہ تربیت سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے اور نہ اخلاق اور ایمان کی سرزمین میں ہدایت کا راستہ نظر آسکتا ہے۔

ہاں تو یہاں پہلے دینی تنظیم کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ یاد رکھئے کہ ہمارے نزدیک دین اور اس کی تنظیم زندگی کے دوسرے شعبوں سے جدا نہیں۔

دین کے ارکان پانچ ہیں:۔ (۱) کلمہ، (۲) نماز، (۳) روزہ، (۴) زکوٰۃ، (۵) حج۔ اس سارے سلسلہ کی بُنیاد ایمان پر ہے۔ ایمان کے اجزاء پھر پانچ ہیں۔ (۱) توحید، (۲) رسالت، (۳) کتب، (۴) ملائکہ، (۵) قیامت۔ زندگی کے تمام شعبوں اور تمام پہلوؤں کی بُنیادی حقیقت ایک توحید ہے۔ اس حقیقت پر ہم ایمان بالغیب رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی علامت سے پکارتے ہیں۔ ہماری زندگی اسی حقیقت کے ارسال کردہ پیغام یا دوسرے الفاظ میں مامور من اللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں بسر ہوتی ہے۔ یہی رسالت کا منصب اور مفہوم ہے۔

مسلمانانِ ہند کی دینی اور داخلی تنظیم کے لئے ہماری سرگرمیوں کے پانچ میدان ہوں گے۔ (۱) مکان (۲) بازار (۳) جلسہ گاہ (۴) مسجد (۵) حلقۂ احباب۔

اس تنظیم کی یہ تبلیغ چھ شکلوں میں کی جائے گی:۔ (۱) تحریکِ خطبات یعنی تقاریر (۲) تحریکِ دُعا۔ یہ بھی تقریر ہی کی شکل میں ہوگی۔ صرف اس میں سامعین کی بجائے اللہ کو مخاطب کیا جائے گا۔ (۳) تحریکِ اذان:۔ کلماتِ اذان دہرائے جائیں گے اور ان کے معنی اور اہمیت واضح کی جائے گی (۴) تحریکِ نماز:۔ رضا کاران کو صف بند کر کے جماعت کی شکل میں ارکانِ نماز کی تربیت دی جائے گی۔ ساتھ ہی ساتھ اجتماعی عمل اور توجہ الی اللہ کے معنی بالوضاحت ذہن نشین کرائے جائیں گے۔ (۵) حلقۂ قوالی:۔ اس محفل میں معانی کی ترجمانی محض ذہنی استدلال سے نہیں بلکہ مکالمۂ قلبی اور تبادلۂ جذبات سے کی جائے گی۔ (۶) تحریکِ تلاوت:۔ قرآن مجید کے منتخب اور حسبِ حال مقامات قرأت سے پڑھ کر ان کا ترجمہ اور تفسیر کی جائے گی۔

معاشرتی، تمدنی، اقتصادی، نسلی اور جسمانی پاکستان:۔

کسی ضابطۂ حیات کا نفاذِ کامل بغیر پورے ریاستی، سیاسی، انتظامی اور فوجی اقتدار کے ممکن نہیں۔ دوسری طرف ریاستی، سیاسی، انتظامی اور فوجی اقتدار بجائے خود کسی گروہ کی معاشرتی، تمدنی، اقتصادی، نسلی اور جسمانی تنظیم کا عکس اور نتیجہ ہوتا ہے۔ انسانی زندگی کے یہ دونوں پہلو لازم وملزوم حیثیت رکھتے ہیں۔ مسلمانانِ ہند چونکہ ریاستی، سیاسی، انتظامی اور فوجی اقتدار سے محروم ہو چکے ہیں اس لئے یہ بات ہمارے لئے ناقابلِ تصور ہے کہ حکومت کبھی ہماری اقتصادی یا معاشرتی بہتری کی ابتداء کرے گی۔ ہمیں اگر اس منحوس چکر کو توڑنا ہے تو معاشرتی اور اقتصادی سرے سے ہی توڑنا ہوگا۔ کیونکہ مقابلتاً یہ ہمارے اپنے بس کی بات ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ ہم یہ حقیقت بھی فراموش نہ کریں گے کہ جب تک ہماری معاشرتی اور اقتصادی قوت جھپٹ کر سیاسی اور فوجی اقتدار پر قبضہ نہیں کر لیتی تب تک ہمیں معاشرتی اور اقتصادی تنظیم کا بھی پورا موقع نہیں ملے گا۔ بے شمار دقتوں کا مقابلہ کرنا ہوگا جو سیاسی اور فوجی قوت سے چٹکی بجانے میں حل ہو سکتی تھیں۔ مگر ان دقتوں سے چارہ نہیں۔ ان کا مقابلہ کرنا ہی پڑے گا۔ ہمارے لئے اقتصادی اور معاشرتی تنظیم کے بغیر سیاسی اور فوجی اقتدار حاصل کرنے کا کوئی امکان نہیں۔

بعض اوقات سطحی طور پر سوچنے والوں کو یہ مغالطہ ہونے لگتا ہے کہ مسلم لیگ کے جھنڈے تلے محض قانونی موشگافیاں کرنے سے ہی مسلمانانِ ہند کو الیکشن لڑ کر پاکستان مل جائے گا یہ ایک سخت مہلک غلط فہمی ہے۔ اوّل تو خود مسلم لیگ کی اہمیت اس کی آئینی جدوجہد کے باعث نہیں بلکہ اس لئے ہے کہ اس نے پاکستان کے تصور سے مسلمان کی علیحدگی کا احساس بیدار کیا۔ دوسرے بالفرضِ محال اگر کبھی انگریز اپنی خانگی مجبوریوں یا بین الاقوامی دباؤ سے مجبور ہو کر ہندوستان چھوڑنے پر آمادہ بھی ہو جائے اور بنیا برہمن بھی حاتم اور لقمان کی قبروں پر لات مار کر ہندوستان کی تقسیم پر تیار ہو جائے تو یہ پاکستان جس کی کمر شریعت فروش نواب کے بوجھ سے دبی ہوگی اور دماغ میں بابو اور اینگلو محمڈن کا خلجان ہوگا، کتنے دن زندہ رہے گا۔ نہیں نہیں! ہم اپنی جداگانہ معاشرت اور معیشت تعمیر کئے بغیر کبھی اپنے جداگانہ ضابطۂ حیات کے لئے سیاسی اور فوجی اقتدار حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ اٹل اور ناگزیر ہے۔

اب اگر پاکستانی معیشت اور معاشرت کی تعمیر ہمارا فرضِ اوّلین ہے تو پہلے ہندوستان کے مسلمان کے موجودہ معیشت اور معاشرت کے مسائل کا تجزیہ کرنا ہوگا۔

اس سلسلہ میں ہمیں تین مسائل درپیش ہیں۔

اوّل تو معیشت اور معاشرت دونوں کو از سر نو اسلامی ضابطۂ حیات کی بناء پر اس طرح منظم کرنا ہوگا کہ گھر کی محنت زیادہ سے زیادہ کم کر کے سیاسی اور اجتماعی سرگرمیوں کے لئے فارغ البالی اور فراغت مہیا کی جائے۔

دوسرے اسلامی خاندان کی ساخت ایسی نہج پر ہونی چاہیے کہ ہماری آبادی جلد از جلد اور زیادہ سے زیادہ بڑھ سکے۔ تبھی تو ہم اپنے تسخیرِ عالم کے پروگرام کے لئے کافی تعداد میں شہداء اور غازی مہیا کر سکیں گے۔

تیسرے انفرادی حیثیت کی بنیاد اس طرح کھڑی کرنی ہے کہ اجتماعی اقتصاد از خود سیاسی اور فوجی اقتدار کا پیش خیمہ ہو۔

موجودہ ہندوستانی مسلمان کی مصروفیتیں:۔

آج اگر ہندوستان میں بسنے والے ایک اوسط بھلے مسلمان کی خانگی زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو وہ مندرجہ ذیل چھ مصروفیتوں کے کشش و پیچ میں گزرتی ہے۔

(۱) فکرِ معاش:۔

یا تو بیچارا صبح سے لے کر شام تک جان توڑ محنت سے کچھ کما لاتا ہے یا گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھا نصیبوں کو روتا رہتا ہے۔ یا رشتہ داروں اور واقفوں کے دروازوں کے چکر کاٹتا رہتا ہے۔ دن بھر کا تھکا ماندہ رات کو گھر آتا ہے تو نہ پیٹ بھر کر روٹی ملتی ہے نہ کسی تفریح کی سکت ہوتی ہے اور نہ بیوی کی مصاحبت کی اُمنگ رہتی ہے۔ اگر بھلا آدمی ہے تو اِدھر اُدھر کے شکوے کر کے ایک مُضطرب دماغ اور مُردہ دل کے ساتھ سو جاتا ہے ورنہ سینما یا سگریٹ کی خراش سے تن بدن کی سوزش دُور کرنے کی کوشش میں خالی جیب کو اور بھی ہلکا کرتا ہے۔ یہی کابوس رات بھر اس کے سینہ پر سوار رہتے ہیں۔ صبح اُٹھتا ہے تو چہرے پر زردی اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہوتا ہے۔

(۲) پرورشِ اطفال:۔

صبح صبح ابھی رات کی بے خوابی سے پنڈلیاں سرسرا رہی ہوتی ہیں کہ بسورتے ہوئے ننھے میاں کو بازار لے جانا ہے اور بخار سے پھنکتی ہوئی ننھی کو ڈاکٹر کے ہاں دکھانا ہے۔ یہ تو خیر صبح و شام ایک دو گھنٹہ کی مصیبت کاٹ کر باہر چلے جائیں گے لیکن گھر والی نصیبوں جلی نے سارا دن اس اسپتال کی تیمارداری کرنی ہے۔ گرمیوں میں لو اور گرمی دانے، برسات میں حبس اور سردیوں

میں ٹھٹھرتی ہوئی ننھی جانوں کو بہلاتا ہے۔ جب بھوک ستاتی ہے، گرمی میں پسینہ چپکتے ہوئے کپڑوں کو شرابور کر دیتا ہے۔ یا سردی کی لمبی راتیں ٹھنڈے بستر میں زکام والے بچوں کے ساتھ بسر کرنی پڑتی ہے، جب پاکستان سے زیادہ گورستان کی طلب ہوتی ہے۔ اس ماحول میں پلے ہوئے بچے کوئی قابلِ فخر کام کر سکتے ہیں۔ یا والدین کو ایسی پرورشِ اطفال کے لئے کوئی اکساہٹ باقی رہ جاتی ہے؟

(۳) سودے لانا:۔

بچوں کا علاج کرانے کے بعد ابھی گھر کے سودے لانے ہیں۔ گھی، لکڑیاں، آٹا، مرچ، مصالحہ، پیاز، لہسن اور پھر پکے گا کیا۔ سبزی، دال شائد گوشت۔ ممکن ہے بیوی نے بھی کچھ فرمائش کی ہو، پیسے کم ہیں اور چیزیں مہنگی۔ چیزیں خریدنے میں اتنی محنت نہیں ہوتی جتنی کوفت دل و دماغ پر رہ جاتی ہے۔

(۴) گھر کی صفائی:۔

خاوند کی مصروفیات تو دیکھ لیں۔ اب بیوی کا تقسیم اوقات ملاحظہ ہو وہ گھر کی بھنگن بھی ہے اور دھوبن بھی اور باورچن بھی اور آیا بھی۔ اب اس نے جھاڑو دینا ہے۔ کپڑے دھونے ہیں۔ چولہے کو ٹھیک کرنا ہے۔ بچوں کو نہلانا ہے۔ کیا یہ معجزہ نہیں کہ ہندوستان کے مسلمان باوجود ان مصروفیتوں کے پاکستان کے متعلق آج بھی سوچنے کا وقت نکال لیتے ہیں۔ کیا یہ تعجب ہے کہ ہماری قوم کی ذہنیت غلامانہ ہے۔ کیا یہ تعجب نہیں کہ اُن میں ابھی تک اتنی حرارت باقی ہے۔ ہماری ہمت غلام نہیں اُسے ایک غلام معاشرت نے غلامی میں جکڑ رکھا ہے۔ ہم یہ بندھن توڑ دیں گے۔

(۵) کھانا پکانا:۔

بیوی نے ابھی کھانا پکانا ہے۔

ہندوستان میں کھانا پکانا شائد تمام دُنیا سے زیادہ مشکل ہے۔ مصالحے کٹیں گے۔ لہسن پسے گا، آٹا علیحدہ گوندھا جائے گا۔ پھر چولھا گرم ہوگا، روٹیاں پکیں گی، سبزی کاٹی جائے گی، ہنڈیا چڑھے گی، گھنٹوں اس کی نگہداشت ہوگی۔ ان میں سے ہر ایک بجائے خود ایک مہم ہے۔ صبح و شام کھانا پکانے میں شائد ہم جتنا وقت صرف کرتے ہیں دُنیا کا اور کوئی ملک نہ کرتا ہوگا۔ یہ سِل بٹے اور لون مرچ کی معاشرت ہمیں قبول نہیں۔

(۶) سینا پرونا:۔

میں بھول گیا۔ بیوی گھر کی درزن بھی ہے۔ اُس نے بچوں کے کپڑے سینے ہیں، اپنے اور اپنے خاوند کے کپڑے سینے ہیں۔ گھر والوں کے کپڑے سینے ہیں۔ بستر کی چادروں کی مرمت کرنی ہے اور یاد رہے کہ رات اُسے بھی بچوں نے سونے نہیں دیا۔ اس کی صحت ٹھیک نہیں۔ اس کے شوہر کو اس کی دلداری کی فرصت نہیں ملی۔ اس کا پیٹ بھی سیر نہیں۔ اکثر گھر والے بھی ایسے ہی زندگی سے چڑچڑے ہو چکے ہیں۔ گھر میں شگفتگی نہیں۔ چاروں طرف بدمزاجی ہی بدمزاجی ہے۔ پھر گھر میں اتنی جگہ بھی نہیں کہ الگ بیٹھ کر بیتا پر رونا کر لیں۔ دل بھر آئے تو الگ بیٹھ کر چار آنسو ہی بہا لیں۔ نہیں سب کا اکٹھے ہی کچھ مرنکلنا ہے۔

یہ ہیں مسلمانوں کی خانگی مصروفیات۔ کیا ان میں اصلاح ممکن نہیں، کیا ذریعۂ معاش اس سے زیادہ یقینی نہیں بنایا جا سکتا۔ کیا بچوں کی پرورش کے لئے مل جل کر ایسا انتظام نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ماں باپ کے لئے وبالِ جان نہ بن جائیں۔ کیا آیا اور ماما اور ملازم صرف امیر لوگوں کے لئے ہی بنے ہیں۔ غریب آپس میں کام بانٹ کر یہ نہیں کر سکتے کہ ایک محلہ کے بچوں کی نگہداشت کرتے تو دوسرا سب کے سودے لا دے۔ اس طرح کتنا وقت بچ جائے، کام کتنا آسان ہو جائے، زندگی سے کتنی کلفتیں دور ہو جائیں، کیسی فراغت ہو جائے۔ مسلمان بننے کے لئے کتنی کشش ہو جائے۔ اسلام جو عاقبت کی برکتیں پیش کرتا ہے ان کے ساتھ دُنیا کی نعمتوں کا اضافہ ہو جائے۔ اگر ہمارے مہتر اتنے غلیظ نہ ہوتے، اگر ان سے چوری کا خطرہ نہ ہوتا تو ان سے صرف گندگی اٹھانے کا کام نہ لیا جاتا، وہ سارا گھر صاف ستھرا رکھنے پر مقرر ہو سکتے تھے۔ اس صورت میں شاید ہمیں اُنہیں دوگنی تنخواہ دینے سے بھی دریغ نہ ہوتا اور شاید پھر وہ اتنے غلیظ بھی نہ ہوتے اور اُنہیں چوری کی بھی ضرورت نہ رہتی۔ محلہ میں دس گھر ہیں تو بیس چولہے جلتے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ تنور والا سب کی روٹی پکا دیتا۔ یہ لوگ خالی وقت میں کچھ کام کر کے اتنا کما لیتے کہ تنور والے کا پیٹ بھی بھر جاتا اور خود بھی چولہے کے آگے منہ جھلسنے سے بچ جاتے مگر مصیبت تو یہ ہے کہ دکان کا کھانا گھر جتنا صاف اور اچھا نہیں ہوتا۔ آخر کیوں نہیں ہوتا۔ کیا گھر میں کوئی طلسم دفن ہے جو دکان میں نہیں۔ ہاں وہاں اتنی توجہ نہیں۔ کیا اس کا علاج یہ نہیں کہ جب سارے محلہ والے عادتاً دکان سے منگوا کر کھائیں تو دکان کی آمدنی بڑھ جائے اور اس آمدنی سے وہاں دیانت دار اور فرض شناس آدمی مقرر کئے جائیں جو گھر جیسا ہی بلکہ اس سے بہتر کھانا تیار کریں، پھر کیا ہماری قسمت میں گندم کی جھلسی ہوئی روٹیاں اور اُبلی ہوئی دالیں اور سبزیاں ہی لکھی ہیں۔ کیا اتنے ہی خرچ سے پھل اور انڈے اور دودھ مہیا نہیں ہو سکتے، کیا موجودہ طریقہ سے پکے ہوئے کھانوں کی

نسبت سادہ اور آسان غذا زیادہ لذیذ اور قوت بخش نہیں ہوتی، کیا یہ بارہ مصالحے لازمی جزو ہیں، کہیں ہمارا غذا کا سارا تصور اور عادت ہی تو غلط نہیں۔ پاکستانی پارٹی کے ممبر نئے طریقے سے زندگی بسر کریں گے۔ نئے کھانے کھائیں گے۔ اُن کی معاشرت بھی اُن کے خیالات کی طرح جوان اور تر و تازہ ہوگی۔ یہ جھلسی ہوئی روٹیوں اور لمبے شوربے والی ترکاریوں کا تمدن بوسیدہ ہو چکا ہے۔ ہم خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع نہیں کریں گے۔ ہمارا عقیدہ توحید پر مبنی ہے۔ ایسی توحید جو ہمارے تمام خیالات پر حاوی رہتی ہے۔ ہم اپنی زندگی کے بنا بھی ایک توحید پر رکھیں گے جس میں تمام ضروریات ایک دوسری سے متحد کر کے ان کا مداوا کیا جائے گا۔ اگر ایک بڑا چولہا جلا کر سارے محلہ کے لئے چار پانچ آدمی اچھی سے اچھی خوراک مہیا کر سکتے ہیں تو ہم بیس چولہے جلا کر کیوں اپنا منہ جھلسیں، وقت ضائع کریں اور دولت برباد کریں۔ ہم مل جل کر گھریلو مصروفیتوں میں کیوں اس طرح ہاتھ نہ بٹائیں کہ سب کو زیادہ سے زیادہ فراغت اور آرام ملے۔

پاکستانی پارٹی کے ذرائع معاش:۔

یہ تمام تجاویز غریب مسلمانوں کے لئے ہیں۔ کھاتے پیتے لوگ بے شک اپنے گھروں میں پکوائیں، لیکن جن کے پاس یہ طاقت نہیں وہ کیوں نہ دوسرا راستہ اختیار کریں۔

اچھا اب یہ دیکھیں کہ ہماری جماعت کا ایک عام رُکن کیا پیشے اختیار کر سکتا ہے۔ جماعت کو ان تمام پیشوں کے متعلق مفصل اعداد و شمار اپنے مرکزی دفتر میں رکھنے چاہئیں۔ یہ نہ ہو کہ ایک علاقے میں جماعت کے اتنے اراکین ایک ہی پیشہ شروع کر دیں جس کی وہاں کھپت نہ ہو۔ یوں خود بھی نقصان اُٹھائیں اور اپنے بھائیوں کو بھی نقصان پہنچائیں۔ یہ بھی نہ ہو کہ کسی علاقہ میں کسی خاص پیشہ کا توڑا ہی ہو جائے۔ نہ، کوشش یہ ہونی چاہئے کہ تمام سرزمین پاکستان میں پاکستان پارٹی کے تمام اراکین کی تمام ضروریات کی کفالت پارٹی ہی کے مختلف اراکین کی وساطت سے ہو۔

پیشے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کا براہ راست وسائل فطرت سے واسطہ ہوتا ہے۔ جیسے کھیتی باڑی۔ یہ اصل پیشے ہیں۔ دوسرے مصنوعی پیشے جن کی بنیاد کسی دوسرے پیشہ پر ہوتی ہے۔ یہ مقابلتاً زیادہ پیچیدہ ہوتے ہیں مثلاً ساہوکارہ یا آڑھتی۔ مندرجہ ذیل فہرست میں زیادہ تر اصلی پیشے درج کئے گئے ہیں۔ یہاں کوئی جامع و مانع فہرست تیار کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ صرف اشارات مہیا کرنے کے لئے انسانی بستیوں کی عام ضروریات مدِ نظر رکھتے ہوئے

موٹے موٹے پیشے گنوا دیے گئے ہیں۔ جماعت بعد میں تفصیلات مہیا کر سکتی ہے۔

(۱) کسان:۔ یہ دُنیا کا سب سے پرانا اور بنیادی پیشہ ہے۔ جماعت کے جو اراکین کھیتی باڑی جانتے ہیں اور اپنی زمین بھی رکھتے ہیں وہ اپنی زراعت کو ترقی دیں، جو کام جانتے ہیں لیکن زمین میسر نہیں وہ کرایہ پر، ٹھیکہ پر جیسے بھی ممکن ہو اراضی حاصل کر کے کام کریں۔ کھیتی اندھا دھند نہ بوئی جائے۔ اس کے پیچھے ایک جماعتی تجویز ہو۔ جدید آلات زراعت سے مدد لی جائے۔ فصلیں اس طرح اگائی جائیں کہ بحیثیت مجموعی پاکستان میں کسی زرعی پیداوار کی کمی نہ رہے۔ جو چیزیں ضرورت سے زیادہ پیدا ہوتی ہیں انہیں بیرونی تجارت کے امکانات سامنے رکھ کر کاشت کیا جائے۔ آج کہیں ریل پر یا سڑک پر شہروں سے باہر سفر کو جائیں تو ایکڑوں زمین ویران نظر آتی ہے۔ پاکستان کا چپہ چپہ پر یا کھیتی باڑی ہوگی یا جنگلات کی نگہداشت ہوگی یا باغات لگے ہوں گے، یا آبادی ہوگی۔ اللہ کی زمین ویرانی کے لئے نہیں۔ فصل اُگ جانے کے بعد جماعت مناسب داموں پر خریدے اور اس کی فروخت اور تقسیم کا بندوبست کرے۔ پاکستان کا کسان اپنی کھیتی کا ایک دانہ اپنے دشمنوں کے منہ تک اُڑ کر نہ جانے دے۔ حکومت جبراً لگان وصول کر سکتی ہے۔ اُسے نقد رقم دے کر ٹرخا دیا جائے۔ ہم اپنی گندم یا روئی اور دوسری زرعی پیداوار دُنیا کے دُور دراز حصوں تک بھیج دیں گے، خود بانٹ کر کھالیں گے لیکن فرنگی اور بنیا برہمن اور شریعت فروش نواب اور اینگلو محمڈن سے جب تک من مانی شرطیں نہ منوالیں گے انہیں کچھ نہ دیں گے۔ مریں بھوکے یا نکلیں یہاں سے یا خود محنت کر کے کمائیں یا ہماری شرطیں مانیں۔ اسی طرح مسلمان صرف پاکستانی کسان کا پیدا کیا ہوا اناج کھائے گا۔ باقی غیر پاکستانی خود ہی اگائیں اور خود ہی کھائیں۔ جب ساڑھے سات کروڑ مخلوق یوں مصمم ارادہ کرے گی اور اچھوت اور سکھ کو اپنے ساتھ ملالے گی اور ہوشمند ہندو بھی ہمارے ساتھ ہوں گے تو بنیا برہمن اور فرنگی بہت دیر ہمارے سامنے نہ ٹک سکیں گے۔ یہ ہے پاکستان حاصل کرنے کا ایک طریقہ جو مسلمان کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ کہیں الیکشن لڑ کر بھی سلطنتیں ملا کرتی ہیں؟

(۲) بڑھئی:۔ لکڑی کا ہر قسم کا کام یہ پیشہ ور کریں گے۔ مسلمانوں کے گھروں میں صرف پاکستانی نجاروں کا بنا ہوا فرنیچر استعمال ہوگا۔ وہ ہماری فطرت کے مطابق نئی کرسیاں، نئی میزیں، نئے چوکھٹے اور نئے دروازے بنائیں گے۔ وقت آنے پر یہی کاریگر سامانِ حرب بھی تیار کریں گے۔ ہماری لکڑی کی صنعت دُنیا کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ ہمارے پاس لوہا کم ہے۔ ہم لکڑی سے مت نئی ایجادات کریں گے۔ آخر ہمالیہ کے جنگلات تو پاکستان ہی میں ہیں۔

(۳) لوہار:۔ ہر قسم کی دھاتوں کا تمام کام یہ لوگ کریں گے۔ پاکستان میں کیا معدنیات پائی جاتی ہیں، اس کی تحقیق ابھی ہونی ہے۔ پاکستانی باشندے صرف دھات کا وہ سامان استعمال کریں گے جو ہماری پارٹی کے ممبروں نے بنایا ہو۔ وقت آنے پر یہی کاریگر ہماری حربی صنعتوں کی ریڑھ کی ہڈی ثابت ہوں گے آخر ہمارے کاریگر کیوں نہ بندوق، پستول، مشینری اور نئی چیزیں بنائیں۔ کیا انگلستان اور امریکہ کے کارخانوں کی بھاری مشینیں انہیں کسی اور ملک نے بنا کر دی تھیں تو ان کا کام چلا تھا۔ پھر ہم کیوں یہ انتظار کریں کہ وہاں سے سامان اور پُرزے آئیں تو ہمارا کام شروع ہو

(۴) موچی:۔ چمڑے کا تمام سامان یہ کاریگر تیار کریں گے۔ مختلف طبقوں کی ضروریات کے مطابق نئے قسم کے جوتے بنیں گے۔ پارٹی کے اراکین صرف پارٹی کے اراکین کا تیار کیا ہوا چمڑے کا سامان استعمال کریں گے۔ جس پر پاکستان کی مُہر ہوگی۔

(۵) تیلی:۔ تمام تیل والے بیجوں سے روغن نکالنے کا کام یہ کاریگر کریں گے۔ ہم صرف اپنی جماعت کے کاریگروں کے بنائے روغنیات استعمال کریں گے۔ روغن نکالنے کے لئے نئے شکنجے اور مشینیں ایجاد ہوں گی۔

(۶) دھوبی:۔ اس پیشہ کو اتنی وسعت دی جائے گی کہ ادنیٰ سے ادنیٰ اور غریب سے غریب مسلمان بھی اپنے پارچات دھوبی سے دھلوا سکے اور سستے سے سستے داموں پر دھلوا سکے۔ کپڑے دھونے کے نئے اجزاء دریافت کئے جائیں گے۔ شاید سوڈا کاسٹک کی نسبت دیکھتے سستے رہیں۔ یہ اجزاء ایسے ہونے چاہئیں اور دھونے کا طریقہ بھی ایسا ہونا چاہئے کہ کپڑوں کی عمر پر بُرا اثر نہ پڑے۔ غرباء کے گھروں میں کپڑے دھونے کا صابن ایک مستقل خرچ کی مد ہے۔ ہم انہیں اس سے نجات دلا کر خاصی فراغت مہیا کر سکتے ہیں۔ ہر روز اُجلے کپڑوں کا جوڑا بدلنا ممکن ہو تو طبیعت میں سربلندی اور فرحت پیدا ہوتی ہے۔ اُجلے کپڑے پہن کر اُجلے خیالات سوجھتے ہیں۔ اُجلے کپڑے والوں کا اجتماع بھلا معلوم ہوتا ہے۔ صرف پارٹی کے ممبروں سے ہی کپڑے دھلوائے جائیں گے۔ یوں اس پیشہ کا معیار بھی خاصا اونچا ہو جائے گا۔

(۷) درزی:۔ تمام پارچات کی سلائی پارٹی کے ممبر درزیوں سے کرائی جائے گی۔ جماعت تمام ممبر درزیوں کی کانفرنس بلا کر زنانہ مردانہ اور بچوں کے کپڑوں کے چند معیاری فیشن مقرر کر دے گی جن میں کپڑا تھوڑا خرچ ہو۔ تراش خراش چست رہے۔ اسلامی آداب لباس ملحوظ رہیں اور شکل بھی بھلی نظر آئے۔ نیز ہندوستان کے تمام غیر اسلامی ملبوسات سے امتیاز قائم رہے۔

جب سب لوگ تمام پارچات درزی سے سلائیں گے تو سلائی اتنی سستی ہو جائے گی کہ غریب لوگ بھی سوزن کاری سے نجات پا جائیں گے۔ بھنگی اور تیلی اور دھوبی کے کپڑے بھی درزی سیا کرے گا نو آموز درزیوں کو باقاعدہ تربیت دے کر کاریگر بنایا جائے گا۔

(۸) قصاب:۔ پاکستان کی تعمیر میں یہ اہم ترین پیشہ ہے۔ جو قوم جس جانور کا گوشت کھاتی ہے اس میں اس کی کچھ خاصیات اثر کر جاتی ہیں۔ جب مسلمان عرب خالی اونٹ کا گوشت کھاتے تھے تو ان میں وہی جفاکشی، صبر، محنت، دور اندیشی اور غیرت کا مادہ تھا۔ جب ہم وسط ایشیا تک بڑھے اور ترکوں اور مغلوں کے زیر اثر گھوڑے اور ہرن کا گوشت کھانا شروع کیا تو وہ دور اندیشی اور مستقل مزاجی تو رخصت ہو گئی لیکن چاق و چوبند اور چست پھر بھی رہے۔ بچھیرے کی طرح اُچھلتے کودتے ملک فتح کرتے پھرتے تھے۔ جب سے افغانستان اور ہندوستان میں آ کر دُنبے اور بکرے کھانے شروع کئے وہی بھیڑ چال اور بُزدلی ہم میں بھی اثر کر گئی ہے۔ فرنگی کو بھی دیکھ لو سؤر کھا کر ویسا ہی خود سر، متکبر اور یکسو بنا پھرتا ہے۔

اب پاکستان میں اونٹ اور گھوڑے تو کھانے کے لئے میسر آنے سے رہے۔ بہر صورت بھیڑ اور بکری کے گوشت سے احتراز کرنا چاہیے۔ اس کی جگہ سانڈ اور بھینسے کا گوشت ہندوستان میں بآسانی میسر بھی آ سکتا ہے اور سستا بھی رہے گا۔ اس کا رواج غریب مسلمانوں میں پہلے بھی عام ہے اب اور زیادہ پھیلانا چاہئے۔ لیکن سانڈ اور بھینسے دونوں میں طاقت کے علاوہ بھدا پن بھی پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ ان کے جسم کے بادی اجزاء ہیں۔ اس کا علاج کچھ تو ہمیں اپنے طبیبوں کے مشورہ سے یوں کرنا چاہیے کہ گوشت کے ساتھ دوسرے لوازمات اور مصالحوں کا امتزاج اس طرح کیا جائے کہ مضر اجزاء کا تنقیہ ہو جائے۔ دوسرا علاج یہ کہ ہندوستان میں مرغ بکثرت پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کے انڈے بھی کھانے کے کام آئیں گے اور اگر اس کا گوشت سستا کر دیا جائے تو مرغ کا جوہر جوانمردی، پامردی اور جنگجوئی بھینسے اور سانڈ کے ساتھ مل کر خوب کام کرے گا۔

یوں ہمارے قصابوں کی دوکان پر بھیڑ بکری کا گوشت کم کر کے گائے، بھینس اور مرغ کا گوشت زیادہ ہوگا۔ بھیڑ بکری سے ہم پشم حاصل کریں گے۔ نیز برآمد کی تجارت کریں گے۔ قصاب گوشت کی مختلف شکلیں مثلاً قیمہ، پسندے، چانپ وغیرہ تیار کرنے کا پورا بندوبست رکھے گا۔

(۹) جولاہا:۔ ہم یارک شائر اور احمد آباد کا کپڑا نہیں خریدیں گے۔ ہمارے جولاہے

کپاس اور پشم اور بکریوں کے بالوں سے ہمارے لئے ہر قسم کا اونی سوتی کپڑا اور کمبل تیار کریں گے۔ کشمیر سے ریشم آیا کرے گا۔ اس سے ریشمی کپڑا بنائیں گے۔ کپڑا اتنی مقدار میں مہیا کر دیا جائے گا کہ ہر شخص دن میں دو مرتبہ کپڑے تبدیل کر سکے۔ یہ اس طرح بھی ممکن بنایا جائے گا کہ لباس صرف دو چادروں پر منحصر ہو۔ ایک تہمد دوسری ڈھیلی ڈھالی عبا۔ بُنے کا تمام کام یہ کاریگر کریں گے۔ یہ ہمارے لئے قالین اور دریاں بھی بنائیں گے۔

(۱۰) کمہار:۔ پاکستان میں دھاتیں کم ہیں۔ یہ دھاتیں ہم اپنی مشینری اور فوجی مقاصد کے لئے استعمال کریں گے۔ ہمارے کھانے پینے اور پکانے دھونے کے تمام برتن چینی مٹی سے بنیں گے جو دریائے سندھ کے طاس میں بکثرت موجود ہے۔ اس وقت ہمارے گھروں میں لوہے اور تانبے اور پیتل کے جو بے انداز برتن پڑے ہیں، سب پگھلا کر ہتھیار بنانے کے کام آئیں گے۔ ہمارے کمہار ہمارے لئے عمارتی اینٹیں، گملے اور ہماری خانہ داری کے برتن بھی کچھ تیار کریں گے۔ بہاول پور کی ریت سے ہم شیشہ کا سامان بھی بنائیں گے۔

(۱۱) طبیب:۔ ہر طبیب کو ہومیو پیتھی، ایلو پیتھی، یونانی اور ویدک کی مکمل واقفیت ہونی چاہئے۔ اس کے علاوہ انہیں نفسیاتی علاج سے سب امراض کا بھی علم ہونا چاہئے۔ جماعت ان پانچوں علاج کے طریقوں کی پوری تفتیش کر کے ایک نئی پاکستانی طب مرتب کرے گی۔ جس میں پانی، بھاپ اور بجلی اور خوراک اور مالش سے علاج کے اصول بھی جذب کر لئے جائیں گے۔ پاکستانی پارٹی کے ہر ممبر کا ہر ماہ مفت طبی معائنہ جماعت کی جانب سے ہوگا۔

(۱۲) حجام:۔ بالوں کی پرورش اور حجامت کے متعلق حجام پورا مطالعہ کریں گے۔ اہل پاکستان یا تو خشخشی رکھیں گے یا پٹے رکھیں گے اور یا سر کے بال اُسترے سے مُنڈائیں گے۔ فرنگی فیشن کے ''بودے'' ہرگز نہ رکھے جائیں گے۔ داڑھی شرعی رکھی جائے گی اور مونچھیں بھی اس طرح کترائیں گے کہ منہ تک نہ آنے پائیں۔ کم از کم ہفتہ میں ایک مرتبہ ضرور حجامت ہوگی۔ یہی حجام سرد گرم حمام بھی چلائیں گے۔ جہاں غسل کا مکمل سامان ہوگا۔

(۱۳) گوجر:۔ گائے، بھینس اور بکری کا دودھ خالص اور سستا سے سستا مہیا ہوگا۔ یہ لوگ شہر سے باہر باقاعدہ نو آبادیاں بنا کر رہائش رکھیں گے۔ مکھن دودھ اور لسی تیار کریں گے۔ گھی بھی بنائیں گے۔ انہیں باقاعدہ تعلیم دی جائے گی۔ وہ ان جانوروں کا پورا مطالعہ کریں گے۔

(۱۴) شیر فروش:۔ گوجروں سے دودھ، لسی، مکھن اور گھی محلہ میں لا کر بیچے گا۔ دہی بنائے گا۔ پنیر اور کھویا بھی تیار کرے گا۔ پڑھے لکھے آدمی یہ کام کریں گے اور اپنے پیشے کا مطالعہ کر کے

مناسب اصلاحات اختیار کریں گے۔

(۱۵) دوکاندار:۔ زرعی پیداوار، مصالحے اور دوسری متفرق اشیاء کھیت یا کارخانہ سے لاکر محلّہ میں فروخت کرنے کے لئے جماعت دیانتدار دوکاندار مقرر کرے گی۔

(۱۶) بزاز:۔ جولاہوں کے کارخانے سے ہر قسم کا کپڑا لاکر محلّہ میں فروخت کرے گا۔

(۱۷) عطار:۔ کیمیاوی طور پر تیار ہونے والی تمام چیزیں مہیا کرے گا۔ ہر قسم کے صابون بنائے گا۔ تمام دوائیاں اس کے ہاں ملیں گی۔ طرح طرح کے رنگ، خوشبوئیں، عطر، عرق، شربت، ست، تیزاب، کھار، سوڈے کی بوتلیں اور اس قسم کی تمام چیزیں تیار کرنے کو بڑے بڑے کارخانے ہوں گے۔

(۱۸) باورچی:۔ ہر قسم کا پھلکا، چپاتی، روٹی، نان، ڈبل روٹی، موسم کی تمام ترکاریوں کے سالن، اعلیٰ گھی اور عمدہ گوشت سے بہترین طریقہ پر تیار کرکے اتنے وسیع پیمانے پر مہیا کرے گا کہ غریب اور اوسط طبقہ کے لوگ گھر کھانا پکانے سے مستغنی ہو جائیں۔ معمول کے کھانے کے لئے ماہوار رقم مقرر رہوں گی۔ مہمانوں اور دعوتوں کے لئے علیحدہ نرخ ہوں گے۔ مقصد صرف نفع کمانا نہیں بلکہ قوم کی صحت بنانا ہوگا۔ کھانا تھوڑی مقدار میں کھایا جائے گا لیکن اس میں چربی، روغن اور پھل اس تنوع سے ہوں گے کہ نشوونما بھی ہو اور طبیعت میں فرحت بھی رہے۔

(۱۹) مہتر:۔ غلاظت ڈھکنے دار بالٹیوں میں اٹھا کر بند گاڑیوں کے ذریعہ باہر پھینکی جائے گی۔ یہ کام صبح شام ہوگا۔ بیچ کے فارغ اوقات میں نہا دھو کر ستھرے کپڑے پہن کر گھروں کی تمام صفائی مثلاً کمروں میں جھاڑو دینا، چیزیں جھاڑنی پونچھنی، برتن صاف کرنا وغیرہ انہیں کے ذمہ ہوگا۔ صرف مسلمان مہتروں سے کام لیا جائے گا۔ اس طرح غریب سے غریب بھی مل کر ملازم رکھ سکتے ہیں۔ کسی ایک کے ملازم نہیں بلکہ محلّہ بھر کے ساجھے ملازم۔

(۲۰) مالی:۔ ہر گھر میں ایک پائیں باغ ہوگا۔ جہاں اس کی گنجائش نہیں وہاں گملوں میں خوشبودار پودے ہوں گے۔ محلّہ میں ایک باغ ہوگا۔ مالی ان سب کی نگہداشت کرے گا۔ علاوہ ازیں اناج کے کھیتوں کی طرح پھلوں کے باغات بھی مالی ہی چلائے گا۔ یہاں پھر مُفلس سے مُفلس کو زندگی کے پھل پھولوں سے حصہ ملے گا۔

(۲۱) گلفروش:۔ مالی اگر پھول اُگائے گا تو گل فروش صبح صبح اُن کے گلدستے اور شام کو پھولوں کے ہار اور گجرے ہمارے گھروں میں مہیا کرے گا۔

(۲۲) گاڑیبان:۔ باربرداری کی گاڑیاں، سواری کی گاڑیاں، سفر کے لئے گاڑیاں، دور دراز سے اناج وغیرہ لانے کی گاڑیاں۔ یہ سب ہمارے گاڑیبان چلائیں گے۔ وہ اپنے کام کا مطالعہ کرکے نئی قسم کی گاڑیاں ایجاد کریں گے۔ بیل گاڑیاں ایسی بھدی اور سست رفتار کیوں رہیں۔ تانگے اس طرح ہچکولے کیوں کھائیں۔ بارش اور دھوپ سے بچنے کیلئے بہتر چھتیں کیوں نہ بنائی جائیں۔ فرنگی کی ریل میں سفر کی بجائے ہم اپنی موٹریں اور بسیں کیوں نہ چلائیں۔ پاکستان بس سروس مشرق و مغرب کے پاکستانیوں کو ایک کردے گی۔

(۲۳) سبزی فروش:۔ ہمارے پاکستانی کسانوں نے کنویں کے پانی سے جو تازہ بتازہ سبزی پیدا کی ہوگی اُسے سبزی فروش محلّہ میں لاکر بیچے گا۔ گندے پانی کی سبزی پاک لوگ نہیں کھایا کرتے۔

(۲۴) سقہ:۔ جب تک حکومت ہمارے ہاتھ نہیں آتی اور ہر گھر میں نلکہ نہیں پہنچتا ہمارے سقے ہر گھر میں کافی مقدار میں پانی پہنچائیں گے۔ ان کا کام صرف پانی اُٹھا کر پہنچانا نہیں بلکہ صاف ستھرا پانی مہیا کرنا بھی ہوگا۔ وہ پڑھ لکھ کر اس کے متعلق تحقیق کریں گے اور ہر گاؤں میں اپنا واٹرورکس قائم کریں گے۔

(۲۵) جرّاح:۔ قدیم جراحی اور جدید سرجری کا پورا مطالعہ کرکے ہمارے جرّاح اعلیٰ درجہ کے ہسپتال قائم کریں گے۔ جہاں قدیم مفید مرہموں کے ساتھ جدید آلات بھی مہیا ہوں گے۔ پاکستان میں بسنے والے پاک جسموں پر گندے پھوڑے اور جسمانی امراض نہ رہیں گے۔

(۲۶) سنگ تراش:۔ پتھر کے متعلق تمام کام یہ کاریگر کریں گے۔

(۲۷) حمال:۔ کئی سادہ لوح نہ کاریگری کا کام کرسکتے ہیں، نہ پڑھ لکھ سکتے ہیں۔ یہ لوگ قلی کا کام کریں گے۔ کارخانوں میں بوجھ ادھر سے اُدھر اُٹھائیں گے۔ دوکانوں پر مددگار کام کریں گے۔ کھیتی باڑی میں مزدور کا کام کریں گے۔ غریب اور اَن پڑھ بھی بے روزگار نہ رہیں گے۔

(۲۸) تیماردار:۔ ہمارے گھروں میں خاصہ وقت بوڑھوں اور بیماروں کی تیمارداری اور بچوں کی دیکھ بھال میں لگ جاتا ہے۔ اب اس کام کے لئے ایک خاص پیشہ ور طبقہ کو تربیت دی جائے گی۔ طبیب تو خالی تشخیص کرکے نسخہ دے گا۔ محلّہ کا تیماردار بچوں کی دیکھ بھال اور بیماروں کی تیمارداری کرے گا۔ یوں ہم اپنے عزیزوں اور بچوں کے آرام کے متعلق بے فکر ہوکر قوم کا کام کرسکیں گے۔

(۲۹) معمار:۔ یہ کاریگر ہمارے لئے عمارتیں اور مکانات اور دفاتر اور کارخانے بنائیں گے۔ پاکستان کی عمارتیں نئی ساخت کی ہوں گی۔ موسم اور جغرافیہ کی رعایت سے مکانات کے

نقشے بنیں گے۔ چونا اور سیمنٹ کی بجائے ہمیں کوئی نیا مصالحہ ایجاد کرنا ہوگا جو ہم کافی مقدار میں بنا سکیں۔ پاکستانی پارٹی کے ہر رکن کو ایک آرام دہ مکان اور باغ ملنا چاہیے جس کے غسل خانے صاف ستھرے اور کمرے ہوادار ہوں۔

(۳۰) نقشہ نویس:۔ علاقہ علاقہ کی عمارتی ضروریات اور گنجائش دیکھ کر تعمیر کے نقشے تیار کرے گا۔

(۳۱) مصور:۔ فوٹوگرافی، تصویر کشی، نقاشی وغیرہ کا سب کام یہ کاریگر کریں گے۔

(۳۲) پرنٹر:۔ چھاپہ خانے کا اہتمام کرے گا۔

(۳۳) کاتب:۔ اردو، فارسی اور عربی کے تمام خطوط میں خوش نویسی اور کتابت کرے گا۔ پاکستان کا رسم الخط بھی تو جدا ہونا چاہیے۔

(۳۴) جلد ساز:۔ کتابوں کی جلدیں باندھے گا اور اس فن کا مطالعہ کر کے اس میں ایجاد کرے گا۔

(۳۵) مصنف اور اخبار نویس:۔ پاکستان کی اپنی صحافت اور مخابرت ہوگی اور اپنے مصنف و مؤلف۔

(۳۶) کتب فروش اور اخبار فروش:۔ ہماری کتابوں اور اخبارات کو محلہ محلہ فروخت کریں گے۔

(۳۷) دباغت:۔ گائے بھینس کو ذبح کر کے جو کھالیں حاصل ہوں گی ان کو رنگنے اور اعلیٰ چمڑا بنانے کے لئے دباغت کا کام ہوگا۔

(۳۸) حلوائی:۔ ہر قسم کی مٹھائیاں تیار کرے گا۔

(۳۹) شیشہ گر:۔ شیشہ کا تمام سامان بنائے گا۔

(۴۰) رنگریز:۔ جولاہے کے بنائے ہوئے کپڑوں کو ہر قسم کے کچے پکے رنگ دے گا۔

(۴۱) مکینک:۔ بجلی اور مشینری کا ہر قسم کا کام کرے گا۔

(۴۲) ثمر فروش:۔ مالی کے پیدا کردہ پھل محلہ میں لا کر فروخت کرے گا۔

(۴۳) قوال:۔ مطالب کو جذبات اور کیفیات کا جامہ پہنا کر خوش الحانی سے ساز کے ساتھ ادا کرے گا۔

(۴۴) صراف:۔ سونے اور جواہرات کا کام کرے گا۔

(۴۵) مالشیا:۔ مالش کے فن میں دستگاہ بہم پہنچائے گا۔

(۴۶) پہلوان:۔ جسمانی ورزش کے متعلق تمام واقفیت بہم پہنچائے گا اور اہل محلہ کو اس کی تربیت دے گا۔

(۴۷) معلم:۔ تمام مروجہ علوم کا مطالعہ کر کے پاکستانی نصاب تعلیم مدون کرے گا اور ہمارے بچوں کو تعلیم دے گا۔

(۴۸) مرغ فروش:۔ مرغ، بٹیر، تیتر پالے گا اور فروخت کرے گا۔ انڈے بھی بیچے گا۔

(۴۹) گڈریا:۔ گوجر تو دودھ کے لئے گائے بھینس پالے گا۔ گڈریا گائے، بھینس، سانڈ، بھینسے، بکریاں اور بھیڑیں گلے کی شکل میں پالے گا تاکہ ذبح کرنے کے کام آسکیں۔

(۵۰) قہوہ فروش:۔ چائے اور قہوہ بنائے گا۔ اس کی دوکان بے تکلف مل بیٹھنے کے لئے کام دے گی۔ جن لوگوں کے گھروں میں علیحدہ بیٹھنے کی جگہ نہیں ہوتی وہ یہاں بیٹھ کر مشورہ اور بات چیت کریں گے۔

یہ ہیں وہ چند پیشے جو پاکستانی پارٹی کے اراکین اختیار کریں گے۔ ان کے ذکر سے کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی معاشرتی، اقتصادی اور تمدنی بہتری کے لئے حکومت کی مدد کے بغیر بھی کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ ذرا آنکھیں بند کر کے تصور کیجئے، پاکستان کے گھر میں آپ صبح صبح بیدار ہوتے ہیں۔ جائے ضرورت سے بدبو کے جھونکوں کے بجائے صحن کے پھولوں کی معطر خوشبو سے آپ کا دماغ مہک اُٹھتا ہے۔ حمام میں جا کر غسل کرتے ہیں۔ گھر کے بچوں اور بیماروں کی نگہداشت تیماردار کر رہا ہے۔ اس لئے بیوی بھی چین سے نہا دھو لیتی ہے۔ حمام سے مسجد گئے۔ فریضہ صبحگاہی ادا کیا۔ وہاں محلہ کے دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ خوش خوش مطمئن اور مسرور دل کے ساتھ گھر واپس آئے، کھانا باورچی کی دکان سے تیار منگوایا، کھایا اور کام پر پہنچے۔ وہاں سے لوٹے تو قوم کی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی اُمنگ بھی ہے اور فرصت بھی۔ قہوہ خانے میں بیٹھ کر دوستوں سے مشورہ کیا۔ شام کو باغ کی سیر کی۔ گھر واپس آئے تو خانگی زندگی کا آرام آپ کے استقبال کو تیار ہے۔ یہ تقسیم اوقات کسی دولتمند کا نہیں بلکہ ایک غریب مزدور کا ہے۔ جس قوم کے افراد یوں خوشحال ہوں اس کی ترقی کون روک سکتا ہے۔ یہاں کپڑے بھی آسان اور سادہ ہوں گے اور خوراک بھی آسان اور سادہ۔ جب معیشت یوں آسان ہو جائے گی تو ہمارا افزائش نسل کا آئندہ پروگرام بھی آسان ہو جائے گا۔

پاکستان میں گھریلو دستکاریاں:۔

جب مسلمان مردؤں کوئی کسب اختیار کریں گے تو ان کی عورتیں بھی گھر بیکار نہ بیٹھیں گی۔ چولہے جھاڑو سے جو وقت بچا ہے وہ اس سے خاندان کی آمدنی میں اضافہ کریں گی۔ ہمارے موجودہ تمدن میں عورت ایک نکھٹو بوجھ ہے جسے اپاہجوں کی طرح کھلانا پلانا پڑتا ہے۔ تبھی تو مسلمان ایک سے زیادہ شادیاں نہیں کر سکتے۔ ذیل میں چند گھریلو دستکاریوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ فہرست مکمل نہیں۔ حسب ضرورت اور حسب استعداد اس میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

(۱) چکی (۲) کشیدہ کاری (۳) چرخہ (۴) بوریا بافی (۵) دستی پنکھے یا ٹوکریاں بنانا (۶) دایا گری (۷) درزن (۸) کلاوہ سازی (۹) کلاہ دوزی (۱۰) آزار بند بنانا (۱۱) نوار بنانا (۱۲) صوباف (۱۳) فیتہ سازی (۱۴) چوڑی سازی (۱۵) چھتری سازی (۱۶) اپٹنہ اور آرائش کے دوسرے سامان تیار کرنا (۱۷) منجن سازی (۱۸) سرمہ سازی (۱۹) سیاہیاں بنانا (۲۰) بڑیاں بنانا، ترکاریاں اور میوے خشک کرنا (۲۱) مربے اور چٹنیاں بنانا (۲۲) بچوں کے کھلونے مثلاً گڑیا بنانا (۲۳) نب اور قلم بنانا (۲۴) محلہ کی عورتوں کی ضروریات کے سامان کی دوکانداری (۲۵) چکیں بنانا۔

غلبہ اسلام کے طریقے:-

اب ہمیں صاف صاف وہ طریقے بیان کرنے چاہئیں جن سے ہمیں فرنگی اور بنیا برہمن اور شریعت فروش نواب پر جسمانی اور اقتصادی غلبہ حاصل کرنا ہے۔ یہ کام تین طریقوں سے ہوگا۔ اوّل اپنی آبادی بڑھا کر، دوسرے اپنی اقتصادی طاقت بڑھا کر اور تیسرے تبلیغ سے مخالفین کو اپنے اندر جذب کر کے۔ پہلے افزائش نسل کو لو۔ اس کے لئے ہمیں مندرجہ ذیل تین ذرائع اختیار کرنے ہوں گے۔

اوّل گاؤ خوری:-

ہندوستان کے غریب مسلمان کی جنسی اشتہا ایک بیوی سے سیر ہو جانے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اُسے درست غذا نہیں ملتی۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ہندوستان میں بہترین غذا گائے کا گوشت ہے۔ اس لئے ہندوستان میں اسلام کا سر بلند کرنا ہے تو گاؤ خوری اور گاؤ کشی کو بطور ایک تحریک کے جاری کیا جائے۔ اس کے ساتھ انبہ خوری اور موسم کے لحاظ سے مونگ پھلی، بادام روغن، تربوز، خربوزہ اور سنگترہ کے استعمال سے جنسی اشتہا اور جسمانی صحت اس درجہ اعتدال پر لائی جائے جہاں ایک توانا اور صالح مرد کبھی ایک عورت سے سیر نہیں ہو سکتا۔

دوم زوجہ اندوزی:-

ہندوستان میں ہم نے اپنی معیشت اتنی بوجھل کر رکھی ہے کہ ایک بیوی سنبھالنی بھی

عذاب ہے۔ لیکن مجوزہ بالا معاشرتی نظام جس کے ماتحت کھانے پینے کپڑے دھونے اور گھر کی صفائی کا انتظام جماعتی طور پر ہوگا، یہ دقت حل کر دیتا ہے۔ اب ہر ایک بیوی کے لئے ایک صرف علیحدہ مکان کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ یہ مکانات جماعت اپنے انتظام سے تیار کرا دے تو بہت کم قیمت پر تیار ہو سکتے ہیں۔ کپڑے صرف تہبند، عبا اور چادر پر منحصر ہوں گے۔ گھر کا فرنیچر صرف ایک چٹائی ایک تخت پوش اور ایک آدھ میز تک محدود ہوگا۔ مسلمان کے گھر میں تکلفات کی کیا ضرورت ہے۔ یوں غریب سے غریب مسلمان بھی چار بیویاں جمع کر سکتا ہے۔

سوم نسل کشی:-

ہندوستان میں ایک ہی بیوی رکھنے کی وجہ جنسیات کا عجیب و غریب اور غیر فطری تصور بھی ہے۔ یہاں میاں بیوی میں جب مصاجت ہو اس کا نتیجہ سوائے مباشرت کے اور کچھ بھی نہیں۔ حالانکہ مباشرت صرف توالد و تناسل کے لئے ہے۔ ورنہ ایک تنومند مرد کی مجالست ہی عام حالات میں عورت کی جنسی تسکین کو کافی ہے۔ یہ مجالست باری باری چاروں بیویوں میں ایک ایک دن کے لئے تقسیم کی جا سکتی ہے۔ گویا ہر چوتھے روز ہر بیوی کو خاوند کی مجالست میسر آ جائے گی۔ رہی مباشرت، تو جو مباشرت فی الحقیقت توالد و تناسل کے لئے ہو اُسے کوئی عام عورت تین مہینہ سے کم وقفہ میں برداشت نہیں کر سکتی۔ برخلاف اس کے مرد مہینہ کے وقفہ کے بعد بالعموم توالد و تناسل کے لئے پھر تیار ہو جاتا ہے۔ عورت اگر حاملہ ہو جائے تو پھر تین چار سال مباشرت کے قابل نہیں رہتی۔ صرف مجالست کی خواہاں ہو سکتی ہے۔ اس طرح کم و بیش ایک مہینہ کے بعد مرد مباشرت کرے اور عورتوں کو تین تین مہینہ کا وقفہ دے تو سب سے انصاف کر سکتا ہے۔

اب مسئلہ درپیش ہے اپنی اقتصادی فوقیت قائم کرنے کا۔ اس کے لئے بھی ہمیں تین وسائل اختیار کرنے ہوں گے۔

اوّل کسب:- ملت کا ہر فرد اُوپر شمار کردہ پیشوں میں سے کوئی پیشہ اختیار کرے تا کہ کوئی نکھٹو نہ رہے۔

دوم ہجرت:- مختلف پیشہ وروں کو تمام سرزمین پاکستان میں اس طرح تقسیم کر دیا جائے کہ کوئی علاقہ کسی پیشہ سے محروم نہ رہے اور ہر پیشہ ور اپنے گرد و پیش اپنی مانگ محسوس کرے۔

سوم تجارت:-

جب ہم اپنی ضروریات پوری کرنے سے فراغت پا چکیں تو جماعت دوسرے

ہمسایوں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے تجارت شروع کرے۔ اگر ہمارا نظامِ معیشت بہتر ہے تو ہم خود کم محنت کر کے اپنے گاہکوں کی زیادہ محنت خرید سکیں گے۔ یوں وہ جلد ہمارے احاطۂ اقتدار میں آ جائیں گے۔

اب رہا سوال تبلیغ کا۔ اول تو جب ہمارا نظام زیادہ آرام دہ اور اعلیٰ ہوگا تو خود بخود لوگ اس کی طرف کھینچے آئیں گے اور ہماری برادری میں شمولیت کے خواہاں ہوں گے۔ دوسرے ہم اُن کے سامنے اُن کے توہمات کا تجزیہ کر کے اپنی اعتقادی برتری واضح کریں گے۔ تیسرے جیسے جیسے ہمارے ضابطۂ حیات کو اقتدار حاصل ہوتا جائے گا ہم دوسرے ضوابطِ حیات کو معزول کرتے جائیں گے، جبر سے نہیں بلکہ ازخود۔

یہی وہ ایمانی طریقہ کار ہے جس سے ہم اپنی تقدیر کی تعمیر خود کر سکتے ہیں۔ اس کے سوا باقی سب طریقے دوسروں پر بھروسہ کرتے ہیں اور جو دوسروں پر بھروسہ کرے گا کبھی پروان نہ چڑھے گا۔

ایمانی طریقہ کار سے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے آخری مرحلے:۔

ایمانی طریقہ کار کی مجوزہ بالا دینی اور اقتصادی تعمیر کا پروگرام دس پندرہ سال میں پورا ہو جائے تو اس کے بعد چاہے فرنگی کوئی جمہوری یا پارلیمنٹری نظام ملک میں رائج کر دے ہمیں سرزمینِ پاکستان میں اس کا تیا پانچہ کرنے میں دیر نہ لگے گی۔

درحقیقت آج ملک میں کانگرس اور مسلم لیگ سمیت جتنی بھی سیاسی تحریکات چل رہی ہیں بنظرِ غور دیکھا جائے تو سب دانستہ یا نادانستہ فرنگی کے ہاتھ میں کھیل رہی ہیں۔ پہلے فرنگی ہوم رول یا سیلف گورنمنٹ یا ڈومینین سٹیٹس یا مکمل آزادی کا ایک پارلیمنٹری اور آئینی تصور پیش کرتا ہے۔ ہم اپنی اُمنگیں اور آرزوئیں خواہ مخواہ اس بے ڈھنگی زبان میں ترجمہ کر کے پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر فرنگی خود ہی اس تصور کے حصول کے لئے کچھ طریقے بھی ہمارے ذہن میں بٹھا دیتا ہے۔ ہم اسی کے بتائے ہوئے ڈھنگ سے بھیک اور دُعا مانگنا شروع کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ بالآخر ہماری آرزو بھی مسخ ہو جاتی ہے اور فرنگی، فرنگی تو ایک کایاں ہے اُس نے طریقہ ہی ایسا تجویز کیا ہوتا ہے کہ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔

مثال کے طور پر الیکشنوں، اسمبلیوں اور ووٹوں کا طلسم ملاحظہ ہو۔ اول تو ووٹ ہی اُس طبقہ کو ملتے ہیں جس نے فرنگی تعلیم پائی ہے۔ فرنگی کو لگان ادا کرتا ہے۔ یا کسی اور طرح فرنگی کا افسوں زدہ ہے۔ باقی اسّی فیصدی عوام کے ووٹ ہی ندارد ہیں۔ پھر یہ ووٹ ایسے حلقوں میں تقسیم

کئے جاتے ہیں جہاں کسی نہ کسی ہیر پھیر سے فرنگی کے معتقدین کی اکثریت ہو جائے۔ ان حلقوں کے ساتھ اسمبلی کے ممبر وہ احمق منتخب ہوتے ہیں جو فرنگی کے نافذ کردہ آئین کا سچ مچ اور دل سے احترام کرتے ہیں۔ دُنیا میں کون گدھا ایسا ہوگا جو دشمن کی تجویز کردہ چالیں اور دستور قبول کر کے جنگ لڑے لیکن ہندوستان کی تمام سیاسی پارٹیاں اور اسمبلیاں ایسے ہی آنریبل گدھوں سے بھرپور ہیں۔ اس میں بنیا برہمن بھی شامل اور شریعت فروش نواب بھی۔

یہ درست ہے کہ ایمانی طریقہ کار سے کام کرنے والے بھی جب سیاسی اقتدار کی طرف ہاتھ بڑھائیں گے تو فرنگی کے مسلط کردہ قوانین اور رسوم کو شروع میں ہی بالکل نظر انداز نہ کر سکیں گے۔ لیکن اگر ایسا ہوگا تو سراسر مجبوری کی حالت میں اور کم از کم ہماری طرف سے پارلیمنٹری آداب شکنی میں کوئی کسر نہ رہے گی۔ ہم صرف اسلامی نظام قبول کرتے ہیں اور باقی سب انتظامات ہمارے نزدیک پاجی ہیں۔

یہ سب کچھ کیسے ہوگا؟ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، یہ کہنے کی باتیں نہیں، کرنے کی باتیں ہیں۔ وقت آنے پر ہی فیصلہ ہوگا کہ ان کو کیسے سرانجام دیا جائے۔

پاکستان کی دُھن سمائی ہے تو مسلمانوں کی باہمی پھوٹ دُور کرنے کی کیا ترکیب سوچی ہے؟

مسلمانوں کی تنظیم کے راستے میں اُن کے مختلف فرقوں اور پارٹیوں کی باہمی جوتی پیزار ایک بڑی رکاوٹ بھی جاتی ہے۔ اگر بچوں کو کسی دلچسپ کام میں منہمک کر دیا جائے تو ان کی شرارت کی عادت دور ہو جاتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ہماری باہمی مار دھاڑ ذہنیت کا بڑا سبب یہ ہے کہ ہمارے لیڈر ہمارے لئے کوئی اور ٹھوس کام تلاش نہیں کرتے۔ مثل مشہور ہے مرد بیکار یا شود دُزد یا شود بیمار۔ جب ہمارے تعمیری پروگرام پر پورے زور شور سے عمل شروع کر دیا جائے گا تو لوگوں کو اتنی فرصت ہی نہ ملے گی کہ باہمی جھگڑے چکاتے پھیریں۔

مسلمانوں کی مایوسانہ ذہنیت کیسے دور کی جائے؟

مُسلمانانِ ہند کی مایوسانہ ذہنیت کا بڑا باعث اُن کی مسلسل اور پے در پے ناکامیاں ہیں۔ غدار اور نااہل لیڈروں نے قوم سے بڑی بڑی قربانیاں کروا کے اُن کے لئے کچھ حاصل نہ کیا۔ اب اگر قوم کا اعتمادِ نفس متزلزل ہو گیا تو اس میں قوم کا قصور نہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ پہلے چھوٹے چھوٹے معاملات کی کش مکش قوم کے سامنے پھیلا کر ظاہر کی جائے۔ پھر اُن چھوٹے

معاملات میں کامیابی حاصل کر کے یہ کامیابی جماعت کے ساتھ متعلق کی جائے اور قوم کے سامنے پورے زور سے پیش کی جائے تا کہ اُن کے حوصلے برقرار ہو جائیں۔

قوم کی مشکلات بے اندازہ ہیں لیکن اگر ہوشیار قیادت میسّر آجائے تو خطابت اور فراست کے زور سے یہ مشکلات کا طومار ہی قوم کی بیداری کا سامان بن سکتا ہے۔ عوام کو ذہن نشین کرا دینا چاہئے کہ ان کی دقتیں بغیر اسلامی ضابطۂ حیات کامل طور پر اختیار کئے دُور نہیں ہو سکتیں۔

غدّار جماعتوں اور رشوت خور لیڈروں کا علاج:۔

آج تک مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم کے راستہ میں بڑی رکاوٹ دو جماعتیں رہی ہیں۔ جو اغیار کے ساتھ اشتراکِ عمل رکھتی ہیں۔ ان جماعتوں میں وفادارانِ فرنگ بھی شامل ہیں اور پرستارانِ وطن بھی۔ ایسے لیڈر بھی کچھ کم ضرر رساں ثابت نہیں ہوئے جو جلبِ منفعت کی خاطر اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر ہوتے رہتے ہیں۔

ہماری رائے میں اِن لوگوں کو کیفرِ کردار سے بچانے والے مندرجہ ذیل اسباب ہیں۔

(۱) وہ عامتہ المسلمین کے مذہبی جذبات کا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

(۲) وہ اسلامی حریت کا رشتہ کانگرس کے نمائشی نصب العین سے جوڑ کر یا فرنگی مفاد کو اسلامی مفاد ظاہر کر کے ہمیشہ اپنی غدّاری کو بظاہر خدمتِ اسلام ظاہر کرتے ہیں۔

(۳) وہ کھائیں چھپ کر بھی تو کم از کم ڈکاریں عوام کے ساتھ مل کر لیتے ہیں۔ عامتہ المسلمین کے سامنے کثرت سے آتے رہتے ہیں۔ سگِ حضوری باز برادر دوری۔ پراپیگنڈا کے چھوٹے موٹے ٹوٹکے ان کو یاد ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اُن کی چوری سینہ زوری سے چھپ جاتی ہے۔ یا اگر وہ مقربانِ فرنگ ہوں تو دولت، لالچ اور حرص کو اُبھار کر اپنا کام کرتی ہے۔

(۴) ہمارے محاذ کی طرف سے فساد کی اصل جڑ تک پہنچے بغیر جو ذاتیات کی بحث چھیڑ دی جاتی ہے اس سے ان کو موقع مل جاتا ہے کہ اپنی غدّاری کو الزامی جوابات کی آڑ میں چھپا لیں۔ یہ ذاتیات کی بحث ایک طرح عوام کو اُن کی طرف راغب کرنے کا اشتہار ثابت ہوتی ہے۔

ہم تو شہرت کے ہیں طالب ہمیں ننگ سے کیا کام
بدنام بھی ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا؟

(۵) ہمارے محاذ میں ابھی کوئی ایسی مقناطیسی شخصیت پیدا نہیں ہوئی جو اپنے کردار کے مقابلہ میں غدّاروں کی غدّاری کا پول کھول دے۔ یہاں جو کوئی بھی ہے وہ حجلہ نشین ہے یا صوفہ

نشین۔ حالانکہ قیادت کرنی ہو تو دن میں کم از کم ایک مرتبہ تو اپنے معتقدین سے ضروریات چیت ہونی چاہئے۔ یہ زمانہ حال کے محمد شاہ رنگیلا اپنے ڈرائنگ روم اور صحن خانقاہ یا حرم سرا سے باہر ہی نہیں نکلتے۔

اندریں حالات اگر ہم اپنی تعمیر غدّاروں کی تخریب سے کرنے کے بجائے اُن کی تخریب اپنی تعمیر کے ذریعہ کریں۔ آئینِ تبلیغ پر پوری توجہ دی جائے اور بجائے گھر میں بیٹھ کر دنکارتے رہنے کے بازار میں کھڑے ہو کر ہر ایک کو دعوت دی جائے تو مقابلتاً کامیابی کی بہت زیادہ اُمید ہو سکتی ہے۔

یاد رکھنا چاہئے ہمیشہ انقلابی جماعتیں اپنے مخالفوں کی زیادہ تعداد کو مٹا کر نہیں بلکہ انہیں اپنے اندر جذب کر کے فتح حاصل کرتی رہتی ہیں۔ ہاں جو تلچھٹ جذب نہ ہو سکے اُسے تباہ بھی کرنا پڑتا ہے۔

حرفِ آخر:۔

جھوٹے ہیں وہ رہنما اور غلطی پر ہیں وہ قائد جو کہتے ہیں کہ "ترقی اور تبدیلی کا راستہ ہمیشہ کے لئے مسدود ہو گیا ہے۔ اسلامی تسخیرِ عالم کا پروگرام بیسویں صدی میں ممکن نہیں۔ مسلمانوں کا مستقبل مخدوش ہے"۔

ہم ایک تمناؤں سے بھرا ہوا دل اور نہ متزلزل ہونے والے قوتِ ارادی لے کر اُٹھے ہیں۔ ہمیں اپنے ایمان پر اعتماد ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ابھی بہت کچھ ہونا ہے۔

لطفِ سیرِ دگر چشمِ تمنا لے گی ایک پلٹا ابھی اور بھی دُنیا لے گی!

آج وہ قوم میں جن کو پاسِ وحدت کا کچھ سامان نہیں محض اپنی ہمت کے بل بوتے پر اپنی شیرازہ بندی کر کے میدانِ عالم میں غرّا رہی ہے۔ پھر کیا وجہ کہ وہ قوم جس کے پاس توحید کا تمام سامان موجود ہے، منتشر رہے اور اپنا مقدر پورا کرتے ہوئے تمام کائنات پر نہ چھا جائے۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبیؐ دین بھی ایمان بھی ایک
حرمِ پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

آؤ مل کر ارادہ کریں:۔

ایک اللہ جل شانہٗ۔ ایک رسول ﷺ۔ ایک خلافت

☆/☆/☆

پاکستان ہوگا کیا؟

(الف) ہمارا تصورِ کائنات:۔

اس کائنات کے متعلق ہمارا عقیدہ یہ نہیں کہ ہمیشہ سے ہے یا ہمیشہ رہے گی۔ بلکہ یہ پہلے نہ تھی اللہ جلّ شانہٗ نے چاہا کہ ہو جائے تو ہوگئی۔ پھر وہ چاہے گا نہ رہے تو نہ رہے گی۔ جب یہ کائنات خود قدیم اور ابدی نہیں تو اس کے حقائق و واقعات اور اصول و استدلال بھی آنی جانی ہیں۔ رب ذات اللہ جلّ شانہٗ کی۔ ہم استدلال کو معجزہ کے تابع مانتے ہیں۔ یہ غیب کا اقرار اور محسوس کی تحقیر ہمارے تمام فلسفۂ حیات میں جاری و ساری ہے۔ ہم رسوم و رواج کے پابند نہیں، وحی و الہام کو مانتے ہیں۔ خود اللہ جلّ شانہٗ کا تصور اس کائنات کے تمام ملوثات سے پاک ہے۔ اللہ جلّ شانہٗ تمام صفات کا بدرجہ اتم مالک بلکہ منبع و مخرج ہے۔ لیکن عالمِ محسوس میں ہمارا اُن صفات کے متعلق جو تصور ہے، اس سے بری ہے۔ اللہ جلّ شانہٗ کا مفہوم ہمارے دلوں میں کچھ اس طرح ہے کہ وہ ایک ارادۂ مطلق ہے جو تمام صفات پر قادر ہوتے ہوئے بھی کسی کا پابند یا کسی سے محیط نہیں۔ مٹ جانے والوں سے ہمیں نفرت ہے اور باقی رہ جانے والوں سے وابستگی۔ اس لئے جتنی کوئی شے دیرپا ہے، اتنی ہی ہمیں اُس کی چاہت ہے اور جتنی کوئی شے عارضی ہے اُتنا ہی ہم اُس سے لاپرواہ ہیں۔ ہماری شخصیت، ہمارے قد و قامت، ہمارے علم و دولت، ہماری طاقت اور شہرت سے نہیں بلکہ ہمارے ایمان اور ارادہ سے معیّن ہوتی ہیں۔

(ب) ہماری نفسیات:۔

کچھ لوگ نفسیات کی بنیاد عقل پر رکھتے تھے۔ پھر معدہ کو نفسیات کا محور سمجھا جانے لگا۔ اب بعض محققین جنسیات کو نفسیات کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ سب غلط ہے۔ نفسیات کی بنیاد نہ محسوسات پر ہے نہ شہوات پر اور نہ تخیلات پر۔ نفسیات کی بنیاد ارادہ پر ہے۔ ارادہ ہماری تمام نفسیاتی زندگی کا نچوڑ ہے۔ جو کچھ حواسِ خمسہ سے ہم محسوس کرتے ہیں، جو کچھ ہم یاد رکھتے ہیں، جو کچھ ہم چاہتے ہیں، جب ان تینوں کو یکجا کر کے ہماری فطرت اپنی نوعیت کا تعین کرتی ہے اور اس فطرت کے مطابق ''عمل'' کا فیصلہ کرتے ہیں تو یہ ارادہ ہے۔ جب ارادہ ایک مستقل اور مسلسل نہج اختیار کرلے اور وہ نہج ہو بھی ہدایت کے راستہ پر تو ہم اُسے ''ایمان'' کہتے ہیں۔

ایمان نام ہے زندگی کی بنیادی وحدت تلاش کر کے اپنے آپ کو اُس سے مطابقت دینے کا۔ ایمان بیک وقت علم بھی ہے، عقیدہ بھی اور عمل بھی۔ ایمان ماضی اور مستقبل دونوں پر حاوی ہے۔ ایمان صرف ہمارے اعمال پر قابو نہیں رکھتا بلکہ وہ ہمارے محسوسات کو بھی معیّن کرتا ہے۔

ایمان تک پہنچنے کے لئے ہمیں اپنی موجودہ نفسیات کو مجتمع کر کے ابتداء کرنی ہوتی ہے۔

(I)۔ توحید خفی اور شرک خفی:۔

(۱) توحید مشاہدہ و شرک مشاہدہ:۔ جو کچھ ہم دیکھتے ہیں، سُنتے ہیں یا دیگر حواسِ خمسہ سے محسوس کرتے ہیں، ایک نظر، ایک مقصد اور ایک نتیجہ تک پہنچنے کے لئے دیکھیں۔ اگر ہمارا مشاہدہ ایسی بنیادی وحدت پر منتج ہوتا ہے تو ہم توحید مشاہدہ سے مشرف ہیں، ورنہ شرک مشاہدہ کے مرتکب۔ مشاہدہ کی توحید یا شرک دونوں عالمِ خفی سے تعلق رکھتے ہیں یعنی پوشیدہ ہیں، ظاہر نہیں۔ اس لئے شریعت اُن پر گرفت نہیں کرتی۔

(۲) توحید مطالعہ و شرک مطالعہ:۔ ہم جو مطالعہ کرتے ہیں اگر وہ ایک وحدت پر منتج ہوتا ہے تو ہم توحید مطالعہ سے مشرف ہیں ورنہ شرک مطالعہ کے مرتکب۔ یہ توحید اور شرک بھی عالمِ خفی سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۳) توحید آرزو و شرک آرزو:۔ ہم جو کچھ چاہتے ہیں اگر وہ ایک وحدت ہے تو ہم توحید آرزو سے مشرف ہیں ورنہ شرک آرزو کے مرتکب۔ یہ توحید اور شرک بھی عالمِ خفی سے تعلق رکھتے ہیں۔

☆/☆/☆

نقشہ

خمسہ عناصر شخصیت

(II)۔ توحید جلی اور شرک جلی:۔

(۱) توحید عمل وشرک عمل:۔ ہمارے افعال اگر متضاد ہیں تو ہم شرک عمل کے مرتکب ہیں۔ اگر ہماری کردنی ایک اکائی ہے تو ہم توحید عمل سے مشرف ہیں۔ یہ شرک اور توحید چونکہ جلی یعنی ظاہر اور کھلی ہے، اس لئے اس پر شریعت گرفت کرتی ہے۔

(۲) توحید علامات وشرک علامات:۔ ہم اپنی نفسانی کیفیات کے اظہار، استحکام یا یاداشت کے لئے جو علامات واصطلاحات از قسم زبان، فلسفہ، علوم، رسوم وغیرہ بناتے ہیں، اگر وہ سب ہماری زندگی اور عقیدہ کے ساتھ اور باہم ایک وحدت ہیں تو ہم توحید علامات سے مشرف ہیں ورنہ شرک علامات کے مُرتکب۔ یہ شرک اور توحید عالم جلی سے متعلق ہے۔

(۳) توحید آثارات وشرک آثارات:۔ اپنے عقائد وافعال کا جو عکس یا نقش ہم اپنے ماحول پر چھوڑتے ہیں۔ مثلاً ہماری عمارات، ہمارا فرنیچر، ہمارے ملبوسات، ہماری صنعتیں وغیرہ۔ اگر ان میں یکسوئی ہے تو ہم توحید آثارات سے مشرف ہیں ورنہ شرک آثارات کے مُرتکب۔ یہ توحید اور شرک بھی عالم جلی سے متعلق ہے اور اس لئے بُت پرستی وغیرہ شرعاً قابل مواخذہ ہے۔

(ج) ہمارا نظریہ شخصیت:۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ اسلام پر ایمان لائے بغیر نہ کوئی شخص مکمل انسان بن سکتا ہے اور نہ ہی اس میں پوری شرافت آسکتی ہے۔ غیر مسلموں اور مسلمانوں کی مثال وہی ہے جو انسان اور بعض ایسے حیوانات کی جن کی شکل وصورت اور عادات انسان سے ملتی جلتی ہیں۔ مثلاً بندر اور انسان کی بہت سے باتوں میں مشابہت ہے۔ بلکہ علم الحیات کے بعض ماہرین کا تو یہ خیال ہے کہ سلسلۂ ارتقاء میں انسان اور بندر کے درمیان محض ایک کڑی کا فرق ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ بندر اس منزل تک پہنچے بغیر انسان اور اشرف المخلوقات کہلانے لگیں۔ علے ہذا القیاس بعض تعلیم یافتہ اور بظاہر مہذب غیر مسلموں کے ایمان میں تھوڑی سی کسر ہوتی ہے۔ لیکن مسلمان ہوئے بغیر وہ مکمل انسان ہر گز نہیں کہلا سکتے اور نہ ہی اُن میں پوری شرافت آسکتی ہے۔

اب رہی یہ بات کہ بعض غیر مُسلم کئی باتوں میں بعض مسلمانوں پر فوقیت رکھتے ہیں یا کچھ غیر مسلم گروہ کئی مسلمان جماعتوں کے مقابلہ پر زیادہ دُنیاوی ساز وسامان اور طاقت کے مالک ہیں تو اس کی مثال ایسی ہے کہ بندر دیوار پر چڑھ سکتا ہے لیکن انسان عام طور پر ایسا نہیں کرسکتا۔ تاہم یہ خیال کسی کو پیدا نہیں ہوا کہ محض دیوار پھاندنے کے شغل میں انسان پر فوقیت رکھنے

کے باعث بندر کو بحیثیت مجموعی انسان پر ترجیح دے دی جائے۔ علیٰ ہٰذا القیاس اگر کچھ غیر مسلم اقوام نے ہوائی جہاز اور دوسری مشینیں ایجاد کی ہیں اور مسلمان ایسا نہیں کر سکے یا اگر کچھ غیر مسلم اقوام تجارت میں ہم سے بازی لے گئی ہیں تو یہ ان کی کلّی فوقیت کی دلیل نہیں بلکہ یہ تو صرف ہمارے سمندِ ہمت کے لئے تازیانے ہیں تاکہ ہم اُن کے افعال دیکھ کر اُن سے اسی طرح فائدہ اُٹھائیں جس طرح کیڑوں پتنگوں کو ہوا میں اُڑتا دیکھ کر انسان نے یہ ہوائی جہاز بنائے۔

رہی طاقت کی بات تو ہاتھی باوجود انسان سے زیادہ طاقتور ہونے کے حیوان ہی کہلاتا ہے۔ پھر اگر باوجود ان حیوانات کے انسانوں پر کئی باتوں میں فوقیت رکھنے کے انسان کا محض انسان ہونا اُسے اُن پر ترجیح دینے کی معقول دلیل ہے تو مسلمان کے لئے بھی صرف اس کا اسلام، اُسے بحیثیت بہتر ثابت کرنے کی کافی دلیل ہے۔

یہاں اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ انسان محض انسان ہونے کے باعث طاقتور حیوانات پر فوقیت نہیں رکھتا بلکہ اس کی فضیلت کا باعث یہ ہے کہ اُس نے اپنی عقل سے کام لے کر ایسے ہتھیار ایجاد کر لئے ہیں جن کے ذریعے وہ ان طاقتور حیوانات پر بھی غالب ہی رہتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ اس قسم کے ہتھیار بنانے اور اُن کو استعمال کرنے کی عقل تو دُنیا کے معدودے چند افراد میں ہوگی لیکن آپ اور ہم ایک احمق سے احمق اور بیوقوف انسان کو بھی جسے بندوق کا ذکر ہی کیا تیر کمان چلانا بھی نہ آتا ہو، اعلیٰ سے اعلیٰ اور طاقتور سے طاقتور حیوان پر ترجیح دیتے ہیں۔ تو وجہ کیا؟ وجہ یہ کہ اس حقیر انسان میں بھی استعداد وہی ہوتی ہے جو بندوق بنانے والے میں۔ لیکن تعلیم و تربیت نہ ہونے کے باعث اُس کی لیاقت کے چشمے سُوکھے پڑے رہ جاتے ہیں۔ آپ اور ہم اس بات کا لحاظ رکھتے ہوئے کہ حیوان میں اس لیاقت کے چشمے سوکھے پڑے رہنے سے بھی ادنیٰ حالت میں ہیں، اس حقیر انسان کے ممکنات کو حیوان کے موجودات پر ترجیح دیتے ہیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس ایک ناکارہ مسلمان، ایک جاہل اور بے وقوف مسلمان، حتیٰ کہ ہندوستان کا موجودہ ذلیل اور فاسق مسلمان بھی ہماری نگاہوں میں واردھا، ماسکو، لندن اور واشنگٹن کے بہترین غیر مسلموں پر ترجیح رکھتا ہے کیونکہ مسلمان کی فطرت کو صرف تعلیم و تربیت اور تنظیم کی حاجت ہے لیکن غیر مسلم تا حال حیوانیت کے اُس درجہ میں ہیں جہاں انسانیت کا مرتبہ حاصل کرنے کے لئے ابھی قبولِ اسلام کی کسر باقی ہوتی ہے۔

اُمتِ مُسلمہ کا یہ خیر الامم ہونا ہمارے عقیدہ کی وہ آخری بنیاد ہے جہاں تسلسلِ دلائل ختم ہو جاتا ہے۔ اسلام کا بہترین مذہب ہونا اور مکمل انسان بننے کے لئے قبولِ اسلام کا لازمی ہونا

ہمارے استدلال کی وہ ابتدا ہے جسے منطق سے نہیں بلکہ عمل کی قوت سے منوایا جایا کرتا ہے۔ خود منطق کو اپنی اس کمزوری کا اقرار ہے کہ آخری دلیل کسی دلیل سے نہیں منوائی جاتی۔

کلام اور منطق کی ابتداء مسلمات سے ہوتی ہے۔ مسلمات کلام اور منطق سے ثابت نہیں کئے جاتے بلکہ عالمِ غیب سے تعلق رکھتے ہیں اور وحی و الہام یا القاء سے نازل ہوا کرتے ہیں۔ اگر کوئی سوال کرے کہ نیکی کیوں اچھی ہے اور برائی کیوں بُری تو اس کا جواب منطق سے نہیں بلکہ عمل سے دیا جائے گا۔ علیٰ ہٰذا القیاس کافر پر مسلمان کی فضیلت کسی لیجسلیٹو ہال یا گول میز پر ثابت نہیں کی جا سکتی بلکہ اس قسم کے مناظرے پانی پت کے وسیع میدان میں پہلے بھی کئی مرتبہ طے ہو چکے اور اب بھی بالآخر کسی ایسی ہی جگہ ختم ہوں گے۔

ہمارے مندرجہ بالا عقیدہ پر عبور حاصل کرنے کے بعد یہ سمجھنا آسان ہے کہ جس طرح اشرف المخلوقات کی خدمت اور نشوونما کی خاطر تمام حیوانات اور نباتات کو قربان کرنا جائز ہے اسی طرح اسلامی مفاد کے لئے غیر مسلموں کو ہر طرح استعمال کرنا نہ صرف جائز اور عین انصاف بلکہ مستحسن ہے۔ ہاں جس طرح جانوروں کو استعمال کرنے میں بے رحمی ممنوع ہے اسی طرح غیر مسلموں کو خواہ مخواہ اذیت پہنچانا ہرگز مناسب نہیں البتہ جہاں اسلام اور اُن کے مفاد میں ٹکر ہو وہاں اسلامی مفاد کی نشوونما کی خاطر اُن کے مفاد کو پامال کرنا کسی طرح انصاف کے خلاف نہیں۔ مرغی کا گلا گھونٹ کر مار ڈالنا ممنوع ہے۔ لیکن اگر انسان کو بھوک لگی ہو تو مرغی کی زندگی کا خیال بھی اُس کے ذبح کرنے میں مانع نہیں ہو سکتا۔

یہ باتیں بعض لوگوں کو "ظالمانہ" اور "وحشیانہ" معلوم ہوتی ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مغربی تعلیم نے اُن کی عصبیت اور رگِ حمیت کو مفلوج کر دیا ہے۔ اُن کی غیرتِ نفس اور جارحانہ ذہنیت کو "زنانہ رواداری" کا زنگ لگ چکا ہے۔

زندگانی قوت پیدا ستے — اصلِ او از ذوقِ استیلا ستے

عفو بیجا سردیٔ خونِ حیات — سکتۂ در بیتِ موزونِ حیات

اگر کارخانۂ قدرت پر ذرا غور کیا جائے تو جس طرح بکری کے لئے گھاس کھانا ظلم نہیں بلکہ عین شفقت و رحمت ہے کیونکہ مردہ گھاس اب زندہ جسم کا جزو ہو جائے گی، جس طرح بکری کا انسانوں کے لئے ذبح کیا جانا ظلم نہیں بلکہ عین شفقت ہے کیونکہ وہ غیر ذوی العقول اب ایک ذوی العقول کے جسم کا جزو ہو جائے گی، اسی طرح کافروں کے ملک اور اُن کے جان و مال کا اسلامی مفاد کی خاطر جذب کیا جانا ظلم نہیں بلکہ عین شفقت و رحمت ہے، کیونکہ اس طرح وہ ایک

اپنے سے اعلیٰ مذہب اور قوم کے اقتدار کا جزو ہوں گے۔

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا!

یہ نہ سمجھا جائے کہ مسلمان صرف دوسروں کی قربانی کا لطف اُٹھانے کی خاطر یہ فلسفہ پیش کرتے ہیں، وہ خود بھی اسی گھاٹ اُترتے ہوئے جہاں دوسروں کو اتارا ہے خلافت کی خاطر جہاد کرتے ہوئے مارا جانا شہادت سمجھتے ہیں۔ ہر تعمیر کی بنیاد کسی تخریب پر ہے۔

می عمارت ہر بنائے کہنہ کا باداں کنند
اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

یہ تو طے ہو چکا کہ اسلامی مفاد کے مقابلہ میں غیر اسلامی مفاد ہمارے سامنے پرکاہ جتنی وقعت نہیں رکھتے۔ اب صرف سوال یہ ہے کہ غیر اسلامی طاقتوں کی تخریب اور اپنی تعمیر کس طرح کرنی چاہئے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ اگر انسان باوجود اپنی فضیلت کے بھیڑیوں کے جنگل میں جا گھسے تو وہ اُسے پھاڑ کر کھا جائیں گے۔

(د) آرٹ کے متعلق ہمارا نظریہ:۔

آرٹ کا لفظی ترجمہ ہے فن، لیکن بالعموم آرٹ سے فنونِ لطیفہ کا مفہوم لیا جاتا ہے۔ یعنی وہ فنون جن میں محض کچھ "بنایا" یا "کیا" نہیں جاتا بلکہ اس "بنانے" یا "کرنے" میں تسکین ذوق کا سامان بھی ہوتا ہے۔ گویا فنونِ لطیفہ کے مفہوم میں دو باتیں شامل ہیں ایک تو فن کا پہلو جسے افادی پہلو بھی کہا جا سکتا ہے۔ کوئی چیز کیسے اور کیوں کی جائے یا بنائی جائے۔ دوسرے اس کی لطافت یا حُسن کا پہلو۔ وہ چیز اس طرح کی جائے یا بنائی جائے کہ بھلی معلوم ہو۔ اس سے ہمارے ذوقِ حسن کی تسکین ہو۔ عام طور پر نقاشی، مصوری، موسیقی، تعمیر، رقص، لٹریچر، سنگتراشی اور ناٹک کو فنونِ لطیفہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

اب اگر اس انسانی ذوقِ حسن کا تجزیہ کیا جائے جس پر فنونِ لطیفہ کی لطافت کا تمام انحصار ہے تو اس کے پھر دو پہلو ہیں۔ ذوقِ حسن ایک طرف تو زندگی کے افادی پہلو ہی کا لطیف حصہ ہے۔ مثلاً ہماری میز پر غلاف اس لئے چاہئے کہ آسانی سے صاف ہو سکتا ہے اور میز کو محفوظ رکھتا ہے۔ اب اگر اس غلاف پر کشیدہ کاری ہو یا بیل بوٹے بنے ہوں تو وہ کام تو وہی میز ڈھکنے کا سرانجام دیتا ہے لیکن اس کام کو اس خوبصورتی سے سرانجام دیتا ہے کہ ساتھ ہی ہمارے ذوقِ نظر کی بھی تسکین ہوتی ہے۔ دوسرا پہلو افادیت سے قطعاً غیر اور حسن قائم بالذات ہے۔ اسی پہلی مثال

کی تلمیح میں اس مفہوم کو ادا کیا جائے تو اس فن برائے فن کی مثال وہ خوبصورت نقش و نگار اور بیل بوٹے والا پردہ ہو گا جو ہم محض اس کے حسن کی خاطر دیوار پر لٹکا دیں۔ یہ پردہ میز کے غلاف کی طرح ہمارا کوئی کام سرانجام دیتے ہوئے بھلا نہیں لگتا بلکہ بغیر کسی غرض کے بھلا معلوم ہوتا ہے اور اسی لئے دیوار پر لٹکا دیا گیا ہے۔

آرٹ کے اس افادی اور ذوقِ نظر کے پہلوؤں کی باہمی تفریق کو زیادہ غور کی نظر سے دیکھیں تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ ایک طرف تو وہ حسن ہے جو ہماری کوئی مادی یا جسمانی حاجت پوری کرتے ہوئے اس کی مادیت یا جسمانیت کو اتنا اوپر اُٹھا کر لے جاتا ہے کہ تخیل اور جذبات بلکہ رُوحانیت تک پہنچا دیتا ہے۔ دوسری طرف وہ حسن ہے جو رُوحانیت یا تخیل و جذبات کو مادی و جسمانی لباس پہنا کر ہمارے سامنے کھڑا کر دیتا ہے۔ پہلی قسم کے حسن کی وجہ تخلیق یا معنویت جسمانی اور مادی حقائق پر مبنی ہے کیونکہ وہی اس کی بنیاد ہیں۔ دوسری قسم کے حسن کی وجہ تخلیق یا معنویت نفسیاتی اور رُوحانی حقائق پر مبنی ہے کیونکہ اس کی پیدائش تخیل و جذبات اور عرفان کی دُنیا میں ہوئی تھی۔

پہلی قسم کے حُسن میں ہم ادنےٰ سے اعلےٰ کی طرف عروج کرتے ہیں۔ جسمانیت اور مادیت سے صعود کر کے غیب کی دُنیا تک پہنچ جاتے ہیں۔ دوسری قسم کے حُسن میں ہم اعلےٰ سے ادنیٰ کی طرف نزول کرتے ہیں۔ غیب سے ہبوط کرتے ہوئے جسمانیت اور مادیت تک اتر آتے ہیں۔

یہی حقیقت ہے جسے بُت پرست یہ کہہ کر ادا کیا کرتے ہیں کہ پوجا مورتی کی ہوتی ہے اور بھگتی دیوتا کی۔

اسلام پہلی قسم کے حُسن اور آرٹ کی اجازت دیتا ہے۔ ہم خوبصورت عمارتیں بنا سکتے ہیں۔ اچھے اچھے بیل بوٹوں اور پھولوں کی نقل اتار سکتے ہیں۔ وہ موسیقی جو مطالب کو جذبات و کیفیات تک پہنچا دے سُن سکتے ہیں۔ وہ لٹریچر جو ہماری ناقص نظروں کو نفوسِ قدسیہ کی بلندیوں تک پہنچا دے پڑھ سکتے ہیں۔

لیکن دوسری قسم کا حسن اسلام میں حسب حیثیت مکروہ یا حرام ہے۔ جو خوبصورت پردے دیواروں پر محض آرائش کی خاطر لٹکے ہوں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسراف قرار دیتے ہوئے اتروا دیئے تھے۔ ہم رقص کی اجازت نہیں دیتے کیونکہ رقص سے محظوظ ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو جنسی شہوات کی جھوٹی، مصنوعی اور اُدھوری تسکین، اور یا توازن، ترتیب، تناسب، تسلسل جیسے مقدس اُصولوں کو فطرت کی وسیع اور کھلی کائنات میں دیکھنے کے بجائے رقاصہ کے

مٹکتے ہوئے کولہوں، پھڑکتی ہوئی رانوں اور چھنچھناتی ہوئی پازیب میں مطالعہ کرنے کا جذبہ معکوس۔

اسفل سے اعلیٰ کی طرح ترقی مومن کا شیوہ ہے، لیکن اعلیٰ سے اسفل کی طرف رجوع تو کسی مشرک ہی کو منظور ہو سکتا ہے۔

ہم بت کشی، بت گری اور بت گری کو بھی ناجائز سمجھتے ہیں۔

ناٹک لکھا ہوا جائز ہے،، بشرطیکہ نفسِ مضمون قابلِ اعتراض نہ ہو۔ لیکن اسٹیج اور پردہ پر نقالی اور سوانگ بھرنا بھانڈوں اور راس دھاریوں کے تمدن میں ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ کوئی مسلمان اتنا ذلیل، پست اور بیکار نہیں کہ زندگی کے حقائق میں سرگرم عمل ہونے کی بجائے تصورات اور توہمات یا قصے کہانیوں اور افسانوں کے بہروپ بھرتا رہے۔

وہ تمام پکے راگ حرام ہیں جن میں صالح مطالب و معانی کو جذبات و کیفیات کے نغمہ میں ڈھالنے کے بجائے جذبات و کیفیات کو ان کی غیر معین شکل میں صوتی جامہ پہنانے کا مشرکانہ گناہ سرزد کیا گیا ہے۔ مسلمان بے وجہ اور بے نشانہ اپنے غم و غصہ یا شادی و مسرت کا برانگیختہ و ضائع ہونا برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کا معبود ایک اور معین ہے تو اس کے مشاغل کیسے پریشان اور لایعنی ہو سکتے ہیں۔ یہ تو قدرت کے مقدس ہتھیاروں سے کھلنڈر بچوں کی طرح کھیلنا ہوا۔ نہیں ہمارے کھیل اور تفریحات بھی لایعنی نہیں۔

تصویر اگر کسی وجود کا عکس محض ہے تو جائز لیکن اگر اس میں کسی کیفیت کو محفوظ یا اس سے کسی کیفیت کو متعلق کرنے کی کوشش کی گئی ہے تو ناجائز۔ کیفیات کی مقدس حقیقتوں کو مصنوعی ذرائع سے مقید اور ملوث کرنا اُن کی توہین ہے۔ مسلمان کی پسند یا ناپسند، اس کا رنج یا خوشی، اس کی وابستگی یا انحراف، واقعات و حقائق سے ہی متعلق ہو سکتے ہیں، ان کے بنائے ہوئے نقوش کا اسیر ہونا یا انحراف واقعات و حقائق سے ہی متعلق ہو سکتے ہیں، انسان کے بنائے ہوئے نقوش کا اسیر ہونا یا اُن سے متاثر ہونا فرزندانِ توحید کے شایانِ شان نہیں، مشرکوں کا شیوہ ہے۔ ہمارا آرٹ ہمارے ماتحت ہے ہمارے سر پر سوار نہیں ہو سکتا۔

شاعری اگر پریشان، آوارہ، بے حیثیت، گمراہ اور جھوٹے جذبات و تخیلات کی بازیچہ گاہ ہے۔ تو لہو و لعب اور ممنوع، اگر سچے اور صالح تاثرات کا مرقع تو قابلِ قبول۔ قصے کہانیاں اور افسانے بھی اسی اصول کے ماتحت ہیں۔

ہمارے آرٹ کے نظریہ سے یہ نتیجہ اخذ نہ کیا جائے کہ ہم خشکی، یبوست یا زہادیت کے علمبردار ہیں۔ نہیں نہیں۔ اسلام حسن و تفریح کا جائز مقام تسلیم کرتا ہے۔ لیکن یہ جائز مقام

زندگی سے متضاد، منحرف یا بے تعلق نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہو تو توحید کے منافی ہوگا۔ ہماری موت و حیات ایک وحدت ہونے کا تقاضا ہے کہ ہماری تفریح اور نظریۂ حسن بھی ہمارے ضابطۂ حیات کے بنیادی مفہوم کے ماتحت ہو۔

اسلامی ضابطۂ حیات کے دو بنیادی مفہومات توحید اور تعیینِ مقامات ہیں۔ توحید بغیر تعیینِ مقامات کے غیر متصور ہے۔ اس لئے جو آرٹ ہر ایک اوست کی تلقین کرتا ہے وہ ہمہ اُوست کا بھی منکر ہے اور ہمہ زاُوست کا بھی۔ اگر زندگی کی ہر حقیقت بجائے خود برحق ہے اور اس کی یہ حقانیت مطلق ہے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ حق مطلق ہے ہی نہیں۔ جو حق مطلق نہیں وہ حق ہی کیا ہوا۔ اس طرح وحدانیت کا انکار زندگی میں سچائی سے انکار ہے۔

غرض آرٹ کی کسوٹی محض اس کا داخلی معیار ہی نہیں بلکہ اُسے زندگی کی اجتماعی محک پر بھی پورا اُترتا ہے۔ اس لئے جو آرٹ اور حُسن، ایمان اور توحید کے تابع نہیں وہ ہمارے نزدیک خوبصورت ہی نہیں، چاہے اس میں بظاہر شباہت حسن کا شائبہ موجود ہی ہو۔ ہم اشیاء کو آخرین نگاہ سے جانچتے ہیں، عارضی اور ہنگامی یا محدود اثرات کے قائل نہیں۔ اللہ جل شانہٗ مٹ جانے والی، محدود اور عارضی اشیاء کو محبت نہیں کرتا تو ہم اللہ جل شانہٗ کے بندے ہو کر ایسا کیوں کریں۔ ہاں اگر مٹ جانے والوں میں انمٹ اور اٹل کی جھلک ہو تو مضائقہ نہیں۔

اے گل بتو خرسندم کہ تو بوئے کسے داری!

(ر) ہماری اقتصادیات:۔

خلافتِ پاکستان کی اسلامی حکومت میں تمام اقتصادی پالیسی کا فیصلہ امیر اُمنائے بیت المال کے مشورے سے کرے گا۔ لوگوں پر سوائے زکوٰۃ، جزیہ اور دوسرے شرعی محاصل کے اور کوئی ٹیکس نہ لگایا جائے گا۔ خلافت کے تمام اخراجات اور آمدنی بیت المال کے ذریعہ ہوگی۔ مسلمانوں کے لئے سُود لینا اور دینا دونوں حرام ہوں گے۔ تمام زمین الارض اللہ (جل شانہٗ) کے مطابق خلیفۃ اللہ کی بھی جائے گی اور اس طرح بیت المال کے ہاتھ میں ہوگی۔ تمام بڑے بڑے کارخانے اور صنعتیں (مثلاً لوہے کے کارخانے، برقی طاقت کے کارخانے، کپڑے بننے کے کارخانے، سامانِ حرب کے کارخانے، ریلوے کمپنیاں، ڈاکخانے، فضائی اور بحری جہاز وغیرہ وغیرہ) بیت المال قائم کرے گا۔ یہ سب صیغے مختلف مجالس کے ماتحت ہوں گے۔ تمام مسلمانوں کو اس کا عادی بنایا جائے گا کہ وہ اپنا جو سرمایہ استعمال نہیں کر رہے ہیں اُسے بیت المال میں جمع

کرادیں۔

(س) ہمارا قانون:۔

خلافت پاکستان کی اسلامی حکومت کا قانون دیوانی اور فوجداری دونوں میں شریعت اسلامیہ ہوگا۔ اجتہادی مسائل میں امیر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔ قانون سازی، مجلس علماء اور مجلس شوریٰ دونوں کے مشورہ سے امیر کیا کرے گا۔ قانون کا نفاذ مفتی، قاضی، محتسب محکمے اور محکمہ کے شیوخ کیا کریں گے۔ سب کے لئے ایک قانون ہوگا۔ ہاں دیوانی میں جو ذمی اسلامی قانون پر اپنے قانون کو ترجیح دینا چاہیں انہیں اس کی اجازت ہوگی۔ لیکن اگر ذمی اپنا مقدمہ اسلامی عدالت میں پیش کرنا چاہیں تو انہیں اسلامی قانون کے ماتحت فیصلہ سننا ہوگا۔ اگر ذمی رعایا اپنے دیوانی قانون کے نفاذ کے لئے مقاطعہ یا اس قسم کے دوسرے پُرامن ذرائع اختیار کرنا چاہیں تو انہیں اس کی اجازت ہوگی۔ یہاں جانبین میں ایک مسلمان اور دوسرا غیر مسلم ہو وہاں دیوانی میں مدعا علیہ کے قانون کے مطابق فیصلہ ہوگا اور مدعا علیہ کی عدالت پر ہی اس کا نفاذ بھی لازم ہوگا۔ فوجداری میں سب شریعتِ اسلامیہ کے قانون کے پابند ہوں گے۔

(ص) ہمارے علوم و تعلیم:۔

مختلف اقوام و ملل کے مختلف تمدنوں کے تمام تاریخی ادوار کے تمام علوم میں سے ہر ایک کی تحقیق و تدوین کے لئے مخصوص علماء کے جداگانہ حلقے مقرر رہوں گے۔

تعلیم کے تین مدارج ہوں گے۔ مکتب، مدرسہ اور دارالعلوم۔ مکتب میں صرف اُردو لکھنا پڑھنا۔ ریاضی کے ابتدائی قاعدے، قرآن مجید مع ترجمہ، اصول قرأت اور چند ابتدائی ورزشیں سکھائی جائیں گی۔ بچوں کو پہلے اسلامی روایات، اسلامی آداب، اسلامی اکابر کی سوانحات اور اسلامی فتوحات کے واقعات سنائے جائیں گے۔ پھر جب انہیں ذرا ہوش آجائے تو مستند کردہ نصاب پڑھایا جائے گا۔ مکتب ہی میں بچوں کو شرائط ایمان، نماز، روزہ اور دوسرے مذہبی فرائض سے بھی آگاہ کردیا جائے گا۔ مکتب کی تعلیم اُمت کے ہر فرد پر حکومت کی طرف سے لازمی ہوگی اور اس کا خرچ بھی حکومت ہی اُٹھائے گی۔

اس کے بعد مدرسہ کا درجہ ہوگا۔ یہاں بھی خرچ تو حکومت اُٹھائے گی لیکن مدرسہ میں داخل ہونا لازمی نہ ہوگا۔ مدرسہ میں قرآن کی تفسیر اور دوسرے مذاہب باطلہ کی تشریح سکھائی جائے گی۔ فوجی تربیت یہاں پورے اہتمام سے دی جائے گی اور خالی ورزشوں پر اکتفا نہ کی جائے گی۔

تمام دُنیا کی مجمل تاریخ اور تاریخ اسلام بالتفصیل پڑھائی جائے گی۔ جغرافیہ، سائنس اور طب کے ابتدائی مسائل سے بھی آگاہ کیا جائے گا۔

اس کے بعد دارالعلوم کی باری آئے گی۔ دارالعلوم قائم تو حکومت کے ماتحت ہوں گے لیکن یہاں کا خرچ خود افراد کو برداشت کرنا ہوگا۔ دارالعلوم میں داخل ہونا لازمی نہ ہوگا۔ طالب علم اپنی مرضی سے جن علوم کو منتخب کرے گا اُن کے متعلق اُسے اعلیٰ تعلیم دی جائے گی۔ تصوّف کا درس دارالعلوم کے سب طلبا کے لئے لازمی ہوگا۔ تبلیغ کی تربیت بھی دی جائے گی۔ علاوہ ازیں فنون حرب میں اعلیٰ اسباق کا انتظام کیا جائے گا۔

مکتبوں، مدرسوں اور دارالعلوم میں صنعتیں اور فنون نہ سکھائے جائیں گے، اس کے لئے علیحدہ تربیت گاہیں ہوں گی۔ مکتب سے فارغ ہونے کے بعد طالب علم وہاں شاگرد ہو سکتے ہیں۔

زنانہ اور مردانہ مکتب، مدرسے اور دارالعلوم علیحدہ ہوں گے۔ ان کے نصاب میں بھی مناسب تفریق ہوگی۔

ان اداروں کے اُستاد تجربہ کار اور جہاں دیدہ لوگ ہوں گے۔ ان کے کردار اور شخصی جاذبیت پر خاص توجہ دی جائے گی۔ اُستاد عام طور پر ایسے لوگ مقرر کئے جائیں گے جنہیں خانگی زندگی کا تجربہ ہو۔

عورتوں کے اداروں میں مردوں اور مردوں کے اداروں میں عورتوں کو کوئی دخل نہ ہوگا۔

اخلاقی اور جسمانی اصلاح:۔

خلافتِ پاکستان میں تمام قوم کو اسوۂ حسنہ کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی جائے گی اور اوامر و نواہی کا نفاذ حکومت کی طاقت سے ہوگا۔

تعلیم و تربیت سے تو جوانوں کو سدھارنے کے علاوہ انہیں جماعتی رنگ میں ورزش کروا کر فوجی تربیت دے کر، شیوخ کے ماتحت کیمپوں میں کچھ عرصہ اکٹھے رکھ کر، اجتماعی چال چلن کے طور طریقے اور آداب سکھائے جائیں گے۔

رائج العام نقائص دور کرنے کی خاطر حکومت کی جانب سے محتسب مقرر رہوں گے۔

(ط) ہماری سلطنت اور سیاست:۔

ہماری تقسیم ہندوستان:۔

ہماری تقسیم انصاف کے کسی ایسے نظریہ پر مبنی نہ ہونی چاہئے جس میں غیر مسلم مفاد کو اسلامی مفاد کے ہم پایہ قرار دیے جانے کا شائبہ تک بھی ہو۔ نہ ہی ہمیں گداگروں کی طرح اپنی قابلیت کا رونا روتے ہوئے اور کمزوری کے درد سے بسورتے ہوئے کسی سے زمین کی بھیک مانگنی چاہئے بلکہ ہمیں تو بحیثیت دُنیا کے نگہبان اور بحیثیت زمین پر خدا کے داروغہ ہونے کے یہ دیکھنا ہے کہ ہماری خدا کی زمین کا وہ زرخیز ٹکڑا جو ایشیا کے جنوب میں واقع ہے جسے دو سو سال پہلے تک ہماری اطاعت کا فخر حاصل تھا اور جس میں ۱۸۶۰ء تک ہماری شریعت امن وامان قائم رکھتی تھی اس کے کسی قدر حصہ کو ہم اللہ جل شانہٗ کے باغیوں سے واپس لے سکتے ہیں اور یہ کہ پھر ہمیں وہاں سے اپنا تسخیر عالم کا پروگرام کس ترتیب سے شروع کرنا چاہئے۔

مسلمانانِ ہند کے لئے ایک علیحدہ قطعہ ارض انتخاب کرتے ہوئے ہمیں مندرجہ ذیل حقائق مدِ نظر رکھنے ہیں:

(۱) ماضی قریب میں مسلمانانِ ہند کے زوال کا بڑا باعث اُن کی لامرکزیت رہی ہے۔ انہوں نے "الارض اللہ" کے یہ غلط معنی سمجھے کہ چونکہ ہمیں کسی ملک سے خصوصیت نہیں اس لئے ہمیں کسی قطعۂ ارض سے واسطہ ہی نہیں حالانکہ ؎

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست!

کا صحیح مطلب یہ تھا کہ انہیں تسخیر عالم کی ابتدا وہاں سے کرنی تھی جہاں اُن کا قیام تھا۔ جس طرح جغرافیائی حدود کی پابندی ہماری جولانگاہ کو محدود اور ہمیں تنگ نظر بنا دیتی ہے اس طرح سرے سے زمین کو اپنانے کی کوشش ہی نہ کرنا ہمارے عزم جہانگیری کو موہوم اور قوتِ تسخیر کو منتشر کر دیتا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ اب ہم کچھ علاقہ سر چھپانے کو جھونپڑے کی طرح لے کر بیٹھ جائیں اور وہاں اپنے آپ کو مرتکز کر کے پھر ایک دفعہ اپنی جڑیں تمام اطراف عالم میں پھیلا دیں۔

(۲) ہمیں مسلمانانِ ہند کا زیادہ سے زیادہ حصہ یکجا رکھنا چاہئے تاکہ اگر کچھ بھائی باہر رہ جائیں تو وہ سخت مجبوری کی حالت میں۔

ان دونوں اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہندوستان پر نظر ڈالی جائے تو دکھائی دیتا ہے کہ دکن میں ہماری سیاست، ہماری کثرت کے بل بوتے پر نہیں بلکہ محض روایات کے باعث اور ایک ریاست ہونے کے سبب قائم ہے۔ اگر ہم نے اس وقت اُسے کسی خالص اسلامی رنگ میں رنگنے کی کوشش کی تو نہ صرف ہماری نشوونما کی ابتدا میں ہی یہ بوجھ ہمارے لئے گراں ثابت ہوگا بلکہ خود دکن میں اسلام کے موجودہ ڈھانچہ کو بھی کمزور کر دے گا۔ اس ٹکڑا گ کو محفوظ رکھنے کی

بہترین صورت یہ ہے کہ اُسے چھیڑا نہ جائے اور فی الحال اپنے حال پر ہی رہنے دیا جائے تا آنکہ ہم اپنے قدم اپنی اکثریت کے علاقوں میں اچھی طرح جما لیں۔ وسط ہند میں بھی ہمارا وجود بکھرا ہوا ہے۔ لہٰذا وہاں اپنے تئیں غالب کرنے کی خاطر ہمیں اس قدر زور صرف کرنے کی ضرورت ہوگی جس کے حصول سے پہلے ہمیں اپنے کھڑے ہونے کی جگہ درکار ہے۔ یہ کھڑے ہونے کی جگہ شمالی ہند کی زرخیز وادی ہے۔ ہندوستان میں ہماری آبادی کی اکثریت یہاں بستی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہم یہاں بحیثیت مجموعی بھی، فرداً فرداً دوسری قوموں کے مقابلہ میں اکثریت میں بھی ہیں۔ اس جگہ عارضی طور پر ہمیں کسی ایسی جغرافیائی فصیل کی ضرورت ہے جو تیاری کے ایام میں ہمارے لئے حصار کا کام دے سکے۔ یہ حصار یہاں گنگا جمنا کی صورت میں موجود ہے۔ اقتصادی اور معدنی لحاظ سے یہ خطہ دُنیا کا بہترین خطہ کہلا سکتا ہے۔ دُنیائے اسلام میں اس کی مرکزی پوزیشن ہمارے لئے بے اندازہ جنگی فوائد کا سبب ہو سکتی ہے۔ پھر ہمیں یہاں سے سمندر پر بھی دسترس حاصل رہتی ہے۔ نتیجہ خلافت پاکستان کا وہ نقشہ ہے جو آپ اس پمفلٹ کے سرورق پر دیکھ سکتے ہیں۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس اچھی بھلی مضبوط زنجیر میں یو۔ پی اور بہار کی دو کمزور کڑیاں کیوں داخل کی گئیں۔ جواب یہ ہے کہ اس کے بغیر زنجیر ہی نہیں بنتی۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ بنگال اور پنجاب کے مسلمان علیحدہ رہیں تو وہ فقط دو دھاگے ہیں لیکن اگر کسی طرح ان کو ملا دیا جائے تو ایک نہ ٹوٹنے والی زنجیر۔ مزید برآں یو۔ پی میں لکھنؤ ہماری خلافت کی سرکاری زبان یعنی اُردو کا مولد۔ آگرہ ہماری تاریخی یادگاروں کا مرکز۔ صرف یہی نہیں بلکہ دہلی ہماری سیاست کا جزو لاینفک۔ میری باتیں سمجھ میں نہ آئیں تو یورپ کی بساطِ سیاست کے شاطروں کی مثال دیتا ہوں، وہ تمہاری سمجھ میں جلد آ جائے گی۔ آخر عہد نامہ ورسائی میں پولینڈ کو جرمنی کے دو ٹکڑے کر کے راستہ دینے کی سوائے اس کے اور کیا وجہ تھی کہ پولینڈ کو سمندر تک پہنچنے کی ضرورت تھی اور اس کے حمائتی اُس کی یہ ضرورت پوری کرنے کی طاقت رکھتے تھے پھر جو پولینڈ کے لئے ممکن تھا وہ خلافتِ پاکستان کے لئے کیوں ناممکن؟

پاکستان کی مجوزہ حدود سے باہر رہ جانے والے مسلمانوں کی حفاظت کیسے ہوگی؟

اسلامی عقیدہ کے مطابق ایک پنجابی یا بنگالی مسلمان اور ایک چینی یا افریقہ کے مسلمان میں اصولاً کوئی فرق نہیں۔ پھر آخر ہم عملاً ہندوستان کے مسلمانوں کا خیال پہلے کیوں کرتے ہیں۔ محض اس لئے کہ وہ ہمارے زیادہ قریب ہیں۔ قریب کے مسلمانوں کی حفاظت زیادہ آسان بھی

ہے اور عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ پہلے پاس والوں کی جمعیت مضبوط کر کے پھر دور والوں کی حفاظت کا انتظام کیا جائے۔ اسی اُصول کا اطلاق خود ہندوستان کے اندر کیا جائے تو پہلے ہمیں ان علاقوں کی تنظیم کرنی چاہئے۔ جہاں ہماری تعداد کا بھی غلبہ ہے اور جہاں کی زمین بھی زیادہ تر ہمارے ہی قبضہ میں ہے۔ اگر ہم نے یہاں پاؤں جما لئے تو پھر ہمارے باقی بھائی ہندوں سے موجودہ ''لاوارث'' مسلمانوں کا سا سلوک نہ کیا جائے گا بلکہ اُن سے وہی سلوک ہوگا جو دُنیا کی دوسری زبردست سلطنتوں کے باشندوں سے کیا جاتا ہے۔ جہاں کہیں ایک بھی مسلمان ہوگا لوگ اُس کی طرف اُنگلی اُٹھانے سے اس طرح ڈریں گے جس طرح بھڑوں کے چھتے کے سامنے کوئی شخص کسی بھڑ کو چھیڑنے سے ڈر سکتا ہے۔

دستورِ خلافتِ پاکستان:۔

چونکہ صرف مسلمان ہی مکمل انسان ہے اس لئے امورِ حکومت میں رائے دینے کا حق بھی صرف مسلمانوں ہی کو حاصل ہوگا۔ ہاں اگر وہ کوئی کام غیر مسلموں کے سپرد کرنا قرین قیاس خیال کریں تو وہ ایسا کر سکیں گے۔ ہمارا دستورِ حکومت اجماعِ اُمت اور اطاعتِ امیر کا وہ امتزاج ہوگا۔ جس کا نام خلافت ہے۔ اس نظامِ حکومت کی اپنی ایک علیحدہ تاریخ ہے۔ جسے ان کے ارتقا کے مدارج اور دیگر تفصیلات پر عبور کا شوق ہو وہ خود اسلامی سلطنت کی تاریخ پڑھے۔ ہماری حکومت کا قائد قوم کا منتخب کردہ امیر المومنین ہوگا۔ جتنا عرصہ اُسے اُمت کا اعتماد حاصل رہے وہ ظل اللہ (جل شانہٗ) اور خلیفۃ الرسول ﷺ ہوگا۔ اُسے بیک وقت امیرِ حکومت اور امامِ مذہب کے اختیارات حاصل ہوں گے۔ لیکن قرآن، حدیث اور شریعت کے متفقہ مسائل کی پیروی اس پر فرض ہوگی۔ اگر وہ اس سے سرِ مُو تجاوز کرے تو ادنےٰ سے ادنےٰ مسلمان بلکہ غیر مسلم بھی اُسے ہر وقت اور ہر جگہ ٹوک سکے گا۔ حدودِ شرعی کے اندر امیر کا اجتہادی قیاس ہماری حکومت کا آخری اور قطعی فیصلہ ہوگا۔ تاہم امیر اس فیصلہ تک پہنچنے کے لئے عام طور پر پہلے مجلس شوریٰ سے مشورہ کر لیا کرے گا۔ مجلس شوریٰ میں قوم کے بہترین اکابر کے علاوہ ایسے مشیر بھی شامل ہو سکیں گے جن کو امیر نامزد کرے۔ مجلسِ شوریٰ کی ہر شعبہ کے لئے علیحدہ مجالس ہوں گی اور ان مجالس میں نیابت مفادات کے اصول پر مبنی ہوگی نہ کہ تعداد کی بنا پر۔

امیر کے انتخاب کے وقت مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھا جائے گا۔

(۱) امیر عقیدہ میں ساری قوم سے زیادہ سخت ہو لیکن عملاً موقع پر لچک جانے کے فوائد

سے ناآشنا نہ ہو۔

(۲) قرآن، حدیث، فقہ اور تاریخ اسلام کے علاوہ علوم جدید پر بھی پورا عبور رکھتا ہو۔

(۳) اس کی ظاہری اور باطنی زندگی قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے رنگ میں رنگی ہوئی ہو۔

(۴) وہ دین کے غلبہ اور اقتدار کا خواہاں ہو۔ افراد کی جنبہ داری نہ کرے۔

خلافتِ پاکستان میں غیر مسلموں سے کیا سلوک ہوگا؟

غیر مسلم ہمارے چھوٹے بھائی ہیں چاہے وہ گمراہ چھوٹے بھائی ہی ہوں۔ ہمیں اُن سے کوئی دشمنی نہیں بلکہ ہمارے دلوں میں اُن کی گمراہی پر افسوس اور رحم کے جذبات موجزن ہیں۔ ہماری خواہش ہر وقت یہی رہے گی کہ وہ ہماری برادری میں شامل ہو جائیں لیکن ہم اُن کے خلاف کسی قسم کی زبردستی نہ کریں گے۔ انہیں ہمارے ماتحت ضرور رہنا ہوگا لیکن وہ ماتحتی ایسی ہوگی جیسی ایک لائق، عقلمند اور ہمدرد کی ایک ناسمجھ شخص کو کرنی پڑتی ہے۔ اسلام کی گذشتہ تیرہ سو سال کی تاریخ اس امر کی ضمانت ہے کہ ہم ذمیوں کے حقوق کی حفاظت مسلمانوں کے حقوق سے کسی طرح کم نہیں کرتے۔ یہ بُری عادت تو غیر مسلموں میں ہی پائی جاتی ہے کہ اُن کے مذہب میں شامل ہو جانے پر بھی غیر اقوام کے لوگ ملیچھ اور اچھوت ہی سمجھے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو ہر کافر ایک ممکن مسلمان سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے ہم کبھی اُس سے دشمنوں کا سا سلوک نہیں کرتے۔ پھر جب وہ ایمان لے آئے اُسی وقت ہماری سوسائٹی کے تمام دروازے اس پر کھل جاتے ہیں۔ ایک چمار مسلمان ہوتے ہی شرعاً کسی بھی مسلمان کی بیٹی بیاہ سکتا ہے۔ ایک بھنگی کلمہ پڑھتے ہی بڑے سے بڑے قاضی، مفتی اور بزرگانِ دین کو جامع مسجد میں اپنے پیچھے کھڑا کر کے نماز ادا کر سکتا ہے بشرطیکہ اُس میں امامت کے ضروری لوازمات موجود ہوں۔ ایک شودر حلقۂ اسلام میں شامل ہوتے ہی حافظِ قرآن بن سکتا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر کھڑے ہوتے ہوئے وعظ کر سکتا ہے۔ پھر ہمارے ہاں یہ باتیں دوسری قوموں کی طرح خالی زبانی جمع خرچ ہی نہیں بلکہ شیخ خالد لطیف گابا کو اپنے بڑے سے بڑے معززین کے مقابلہ میں اپنا نمائندہ منتخب کر کے مسلمانوں نے ثابت کر دیا ہے کہ ہم آج بھی کہاں تک نومسلموں کی تالیفِ قلوب کا خیال رکھتے ہیں۔

اندریں حالات ہم سے کسی قسم کے تعصب کا خطرہ رکھنا محض جہالت پر مبنی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہم حکومت کے قابل صرف اُس شخص کو سمجھتے ہیں جو اللہ جل شانہٗ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافت پر ایمان رکھتا ہو۔ ہم خلافت کے ٹھیکیدار نہیں۔ اگر آج مہاشے گاندھی یہ شرطیں

پوری کردیں تو وہ خلافت کے ویسے ہی اہل ہوں گے جیسے فلسطین کے مفتیٔ اعظم۔ ہم غیر مسلموں کو ماتحت ضرور رکھیں گے، لیکن اپنے ماتحت نہیں بلکہ اللہ جل شانہٗ کے اصولوں کے ماتحت۔ اگر وہ ان اصولوں کو قبول کرلیں تو ہم خود ان کے ماتحت رہنے کو تیار ہیں۔

خلافتِ پاکستان کا جھنڈا:۔

خلافتِ پاکستان کا جھنڈا ایسا ہونا چاہئے جو ایک طرف تو خلافت کی گذشتہ تیرہ سو سال کی تاریخ کا لب لباب ہو اور دوسری طرف وہ ہمارے سیاسی مقصد کو بھی ظاہر کر سکے۔ چنانچہ سرورق پر ہمارے مجوزہ جھنڈے میں ایک طرف تو کلمۂ شہادت اسلامی تعلیم اور مسلمانوں کے سیاسی مقصد کو چند الفاظ میں بیان کر دیتا ہے، دوسری طرف اس کے چاروں رنگ ایسے ہیں، جو ہمارے سامنے ایک نظر میں شروع سے لے کر آخر تک خلافت کی تاریخ پیش کر دیتے ہیں۔ پہلے سیاہ رنگ کو لیجئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جھنڈا رایۃ العقاب سیاہ تھا۔ پھر خلافت عباسیہ کی سطوت بھی اسی رنگ میں جھلکتی نظر آتی ہے۔ سفید بنو امیہ کے شکوہ کی یادگار ہے۔ سبز ہسپانیہ میں ہماری سات سو سالہ کی تاریخ اور تمدن کا افسانہ خواں ہے۔ پھر مصر کے بنو فاطمہ کا جھنڈا بھی سبز تھا۔ سرخ میں خونِ شہدا کی جھلک نظر آنے کے علاوہ بنو عثمان کے کارنامے لکھے ہیں۔ سرخ انقلابی رنگ بھی ہے۔ ہلال بھی خلافت عثمانیہ کی نشانی اور قمری سن وسال کا علمبردار ہے۔ رہی کھجور تو جس طرح اسلام عرب سے نکل کر پھلا پھولا اور آج تک مکہ کے کعبہ سے وابستہ ہے، اسی طرح ہمارا جھنڈا بھی اسی سرزمین کے مخصوص درخت سے آویزاں ہے۔ جن لوگوں کو فنونِ لطیفہ سے مس ہے وہ حظ اٹھا سکتے ہیں کہ کھجور کی سربلندی، سرسبزی، شیرینی اور اکیلے تنے پر اس کے مدور جھنڈ کو سلامتی کے دین اور وحدت کی سیاست سے کیا مناسبت ہے۔

خارجی حکمت عملی:۔

خارجی حکمت عملی مندرجہ ذیل پانچ اصولوں پر مبنی ہوگی۔

(۱) زمانہ کے حالات تبدیل ہونے کے ساتھ ساتھ حکمتِ عملی میں بھی تبدیلیاں کرنی پڑتی ہیں۔ اس لئے اگرچہ ایک مستقل خارجی حکمت عملی مفید ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ مقصود بالذات نہیں۔

(۲) حکومتوں کی دوستی میں ہمیشہ یہ خیال رکھنا چاہئے کہ ہماری حکومت کو زیادہ سے زیادہ، اہم سے اہم اور مستقل سے مستقل فائدہ پہنچتا رہے۔ اگر ہم دوسروں کے مفاد کا کچھ لحاظ کریں تو محض اس خاطر کہ انہیں ہمارے مفاد کی حفاظت کی ترغیب ہو۔

(۳) ایسے حلیف تلاش کرنے چاہئیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ہمارے اور اُن کے مفاد میں روز بروز زیادہ یکجہتی پیدا ہوتی رہنے کی اُمید ہو۔ ایسی ہنگامی دوستیوں سے حتی الوسع بچتے رہنا چاہئے جو کچھ عرصہ کے بعد دشمنی میں تبدیل ہو جانے کا خطرہ ہو۔

(۴) اپنے مقاصد اور مفاد کو پہلے خود اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے۔ پھر اُن کو صاف صاف بیان کر دینا چاہئے، لگی لپٹی رکھنے والے ہوشیار شخص کی نسبت سیدھا سادھا صاف گو انسان بازی لے جاتا ہے۔ کیونکہ اوّل الذکر کو بار بار بدلنا پڑتا ہے اور آخر الذکر کی بات چاہے تلخ ہو لیکن ہوتی مستقل ہے۔

(۵) ہمیں وہ ساتھی چاہیے جو خود بھی کسی شے کا طالب ومشتاق ہو کیونکہ وہ اپنے حصول مقصد میں ہم سے فائدہ اُٹھانے کی خاطر خود بھی ہمارے لئے کوئی قربانی کرنے کو تیار ہوگا۔ جو پہلے سے مطمئن ہے، اُسے ہماری کیا ضرورت ہے۔ جسے ہماری ضرورت نہیں وہ ہماری کوئی ضرورت کیوں پوری کرنے لگا۔ دُنیا میں آج تک حکومتوں کی دوستی کبھی بے غرض نہیں ہوئی۔ اس لئے ہمیں صرف یہ خیال رکھنا چاہئے کہ اُن طاقتوں کو دوست بنایا جائے، جن کے مفاد ہم سے مشترک ہوں اور جن کے مقاصد ہم سے ملتے جلتے ہوں۔ اس تلاش میں رہنا ضروری نہیں کہ ان مقاصد کے اسباب ووجوہات بھی وہی ہوں۔ جو ہمارے ذہن میں ہیں۔

(ع) ہمارے ہتھیار خُفیہ اور نئے، ہم لڑیں گے کیسے اور جیتیں گے کیسے؟

جنگ کا مقصد کیا ہوتا ہے؟

لڑائی دو باتوں پر ہوتی ہے یا تو جب ہم کچھ کرنا چاہتے ہیں اور دوسرے ہماری اس کرنی سے ہمیں روکنا چاہتے ہیں یا جب دوسرے کچھ کرنا چاہتے ہیں اور ہم انہیں ان کے کردار سے منع کرنا چاہتے ہیں۔ لڑائی کا فیصلہ بھی دو ہی طرح ہوتا ہے، یا تو ایسا رُوحانی، اخلاقی، نفسیاتی، معاشرتی، اقتصادی یا جسمانی دباؤ ڈالا جاتا ہے، جس کی تاب نہ لا کر ایک فریق چیخ اُٹھتا ہے اور اپنا ارادہ غالب کی مرضی کے مطابق موڑ لیتا ہے، دوسری صورت میں مغلوب اپنا ارادہ ترک کرنے پر مائل نہ بھی ہو تو رُوحانی، اخلاقی، نفسیاتی، معاشرتی، اقتصادی یا جسمانی طاقت سے جیسے بھی حالات اجازت دیں اور جیسے بھی ممکن ہو غالب اپنی کرنی پوری کر لیتا ہے یا مغلوب کی کرنی بند کر دیتا ہے۔

ہتھیار لڑائی کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ اس لئے ان کے بھی دو ہی مقاصد ہوتے ہیں یا تو مخالف کی رُوحانی، اخلاقی، نفسیاتی، معاشرتی، اقتصادی یا جسمانی ڈھال کو چیر کر اس پر ایسا

وار کرنا کہ اس کی کرنی رُک جائے یا اپنے لئے ایسی رُوحانی، اخلاقی، نفسیاتی، معاشرتی، اقتصادی یا جسمانی ڈھال تیار رکھنا جس پر مخالف کے حملے تمام کر اپنی کرنی جاری رکھی جائے۔ جارحانہ اور مدافعانہ ہتھیاروں کا ازل سے یہی مفہوم رہا ہے۔

ہتھیاروں کی اقسام:۔

انسانی کرنی یا رُوحانی ہوتی ہے یا اخلاقی یا نفسیاتی یا معاشرتی یا اقتصادی اور یا جسمانی۔ اس لئے انسان کے ہتھیار بھی یا رُوحانی ہو سکتے ہیں یا اخلاقی یا نفسیاتی یا معاشرتی یا اقتصادی اور یا جسمانی۔

ہمارے خفیہ اور نئے ہتھیار رُوحانی، اخلاقی، نفسیاتی، معاشرتی، اقتصادی اور جسمانی بھی قسم کے ہوں گے۔ البتہ چونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ رُوحانیات، اخلاقیات، نفسیات، معاشریات، اقتصادیات اور جسمانیات سب کی تہ میں ایک بنیادی حقیقت ہے، اس لئے ہمارے سب سے زبردست ہتھیار ایمانی ہتھیار ہوں گے۔

پچھلی جنگ ٹینک اور ہوائی جہاز پر ختم ہوئی تھی تو موجودہ جنگ ٹینک اور ہوائی جہاز سے شروع ہوئی۔ اسی طرح موجودہ جنگ ایٹم بم اور راکٹ انجن پر ختم ہوئی ہے تو آئندہ جنگ ایٹم بم اور راکٹ انجن سے شروع ہوگی۔ ہمیں اگر وہ جنگ جیتنی ہے تو ایٹم بم سے زیادہ خوفناک اور مؤثر ہتھیار حملہ کے لئے ایجاد کرنا ہوگا۔ راکٹ انجن سے زیادہ تیز رفتار انجن بنانا ہوگا۔ ان حملوں سے بچنے کے لئے دفاعی تدابیر اختیار کرنی ہوں گی۔

آئندہ جنگ کے لئے سب سے بڑی رزمگاہ میدانِ نفسیات ہوگا۔ ہم قوتِ ارادی سے حملہ کر کے مخالف جذبات کا تجزیہ کر دیں گے۔ یہ ہمارا جارحانہ اقدام ہوگا۔ مدافعانہ پہلو سے ہمارے جذبات کی بنا محسوسات کے بجائے وحی، القا، الہام، ارادہ اور ایمان پر ہوگی اس لئے ہمارے پائے استقلال کو کوئی لغزش نہ دے سکے گا۔

جب ہم تقوٰی اور ایمان سے ارادہ کو مضبوط کر لیں گے تو ہماری ادنیٰ توجہ علم، فلسفہ اور معتقدات کے بڑے سے بڑے پہاڑ کو پاش پاش کر دے گی۔

فوج اور جہاد:۔

مسلمان کی ہر حرکت اس کا عمل ہے۔ اس کی تمام زندگی ایک جہاد ہے۔ اس کے جہاد اور عمل کا واحد مقصد اعلائے کلمۃ الحق ہے اس میں جوع الارض کا شائبہ تک نہیں۔

جہاد ہر مسلمان پر فرض ہے ہاں ہر شخص کی استعداد اور حالات کے مطابق جہاد کی

صورتیں مختلف ہو سکتی ہیں۔

اسلامی فوج کے سپاہی مجاہدین ہوں گے۔ جو لوگ اپنے اخراجات خود اُٹھانے کی استعداد نہ رکھتے ہوں، اُن کا وظیفہ خلافت کے ذمہ ہوگا۔ مالِ غنیمت میں ہر مجاہد کا حصہ ہوگا۔ علاوہ ازیں خلافت کی کوشش ہوگی کہ جہاں وہ ہر مسلمان سے فوجی خدمت کی توقع رکھتی ہے وہاں اُس کے روزگار کا بھی بندوبست کرے۔ جو غیر مسلم فوجی خدمت نہ دینا چاہیں گے اُنہیں جزیہ ادا کرنا ہوگا۔

تبلیغ:۔

تبلیغ کے لئے خلافتِ پاکستان میں ایک علیحدہ اور زبردست شعبہ ہوگا۔ اس شعبہ میں بڑے اہتمام سے مبلغ تیار کئے جائیں گے۔ مبلغین کی پشت پر حکومت کی تمام طاقتیں ہوں گی۔ حکومت کا فرض ہوگا کہ تمام غیر ممالک میں مبلغین کے لئے سہولتیں بہم پہنچانے کا انتظام کرے۔

نئے ہتھیار:۔

ہمارا سب سے بڑا ہتھیار ہم خود ہوں گے۔ ہماری شخصیت اور چلن بڑے بڑے کافر دلوں کو پگھلا کر موم کر دیں گے۔ ہماری کشش خود غنیم کے دلوں اور اُن کے گھروں میں پھوٹ پیدا کر دے گی۔

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانوں سے!

دراصل ہتھیاروں کی ندرت اس پر منحصر ہے کہ ہر جنگ کے لئے مخصوص حالات کے مطابق تیار کئے جائیں۔ ورنہ ہتھیاروں کے اصول دو تین ہی ہیں، اور وہ صدیوں سے وہی ہیں جو ہمیشہ تھے۔ جو غرض کبھی پتھر اور غلیل سے پوری ہوتی تھی، تیر کمان بھی اسی کو پورا کرنے کے لئے ایجاد ہوا تھا۔ بندوق بھی اسی مقصد کے لئے بنی تھی اور اب اٹن بم اور ایٹم بم بھی وہی کام کرنا چاہتے ہیں۔ جو حفاظت کبھی ڈھال اور زرہ سے ہوتی تھی پھر بکتر کی پلیٹوں سے ہونے لگی۔ قلعے بننے لگے۔ خندقیں کھدیں، کنکریٹ کے مورچے تیار ہوئے، ٹینک ایجاد ہوا۔ اب ریڈار کی کرنیں دور ہی دور غنیم کے ہوائی جہاز روک کر وہی کام کرتی ہیں۔

ہمارے نئے ہتھیار بھی انہیں اُصولوں پر بنیں گے، لیکن اپنے ماحول کی ضروریات کے مطابق نئے انداز میں بنیں گے۔

خفیہ ہتھیار:۔

کائنات مختلف قوتوں سے پُر ہے۔ ہر پہلوان اپنی ہمت اور برداشت کے مطابق اس میں سے پیالے بھر کر پی لیتا ہے۔ ہم چونکہ کائنات کی بنیادی توحید سے واقف ہیں، اس لئے ہم ایسی ایسی مخفیہ طاقتوں سے ہتھیار تیار کریں گے جو غنیم کے خواب وخیال میں بھی نہ ہوں گی۔

/☆/☆/☆/☆

ہم ایک قوم ہیں یا اُمّت؟

جب سے حضرت انسان اس دُنیا میں آباد ہوئے وہ مختلف ٹولوں میں بٹے رہے۔ پہلے یہ ٹولے قبائلی بنیادوں پر بنتے تھے، پھر ملکی اور لسانی تقسیم ہونے لگی۔ پھر اقتصادی اور تاریخی رابطوں کی بنیاد پر مختلف ملکوں میں بسنے والے ایک قوم کہلانے لگے۔ تاہم نسلی اور لسانی رابطے آج تک زبردست اہمیت رکھتے ہیں۔ اکٹھے رہنے والوں میں رسوم ورواج، اخلاق اور تمدن کے رابطے بھی قائم ہوگئے۔ مذہب نے ان سب سے اوپر ایک اپنا رابطہ قائم کیا اور باقی سب روابط کو اپنے ماتحت لانے کی کوشش کی۔ موجودہ دُنیا میں سیاسی اور معاشی عقائد کی بناء پر پارٹیاں بننے لگی ہیں۔ جو بجائے خود قومی روابط سے اونچا اُٹھ کر اپنا علیحدہ رابطہ کرنا چاہتی ہیں۔

آج کی دُنیا میں قومی رابطے:۔

اگر آج دُنیا پر نظر ڈالیں تو جس رابطہ کو قومی رابطہ کا نام دیا جاتا ہے وہ بالعموم دوسرے تمام رابطوں پر غالب ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد آج انسانیت کے تین بڑے بڑے ٹولے ہورہے ہیں جو طاقت واقتدار اور اثر ونفوذ کے لحاظ سے باقی کے لوگوں کو پروں تلے سمیٹے بیٹھے ہیں۔ ان کے نام ہیں امریکہ، روس اور انگلستان۔

ان اقوام کی اپنی حد بندی، ملکی، نسلی، لسانی، تاریخی اور معاشرتی اثرات سے مل جل کر ہوئی ہے۔ اب ایک تمدن ہے، ایک اخلاق ہے اور سب سے بڑھ کر یہ ایک سیاسی قصد ہے۔ اس داخلی تنظیم کے بل بوتے پر یہ تینوں گروہ باقی کے بنی آدم کو اپنی غلامی میں پروئے بیٹھے ہیں۔

مسلمان ایک قوم ہیں یا اُمّت؟:۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہم مسلمان بھی ان معنوں میں ایک قوم ہیں؟

اس سوال کا جواب نہایت آسان ہے۔ ہم مروّجہ معنوں میں ہرگز ایک قوم نہیں۔ اوّل مسلمان کسی ملک کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتے۔ پھر ہماری کوئی قومی زبان نہیں۔ دُنیا کا ہر شخص تبدیل مذہب کے بعد ہمارے اندر شامل ہوسکتا ہے۔ یہ باہر سے آنے والے اتنی تعداد میں شامل ہوسکتے ہیں کہ موجودہ مسلمانوں سے اُن کی تعداد بڑھ جائے۔ یہ صرف اصول نہیں بلکہ تاریخ میں کئی مرتبہ ایسا ہو بھی چکا ہے۔ روسی کبھی جرمن نہیں بن سکتے، جرمن فرانسیسی نہیں بن سکتے، فرانسیسی انگریز نہیں بن سکتے۔ انگریز امریکن نہیں بن سکتے اور امریکن جاپانی نہیں بن

سکتے۔ دوسری قوم کے پانچ چھ ہزار افراد بھی آ شامل ہوں تو ڈر اور رنج سے تڑپ اٹھتے ہیں۔ برعکس اس کے روسی، جرمن، فرانسیسی، انگریز، امریکن اور جاپانی سب مسلمان بن سکتے ہیں۔ کروڑوں کی تعداد میں بن سکتے ہیں۔ ہم مسلمان اس پر خوشی سے پھولے نہ سمائیں گے۔ اپنے نومسلم بھائیوں کا تہِ دل سے خیر مقدم کریں گے۔ ہماری مسجدوں کے محراب و منبر، ہمارے گھروں کی عزیز ترین دولتیں اور ہمارے دسترخوان اُن کے لئے یکساں حلال ہوں گے اور ہم اس پر فخر کرتے ہیں۔

ہماری گروہ بندی کی بنیاد یہ ہے کہ جو شخص خدا جل شانہٗ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے وہ ہمارے اندر شامل ہو سکتا ہے۔ ہم اپنے پیغمبر ﷺ کی اُمت ہیں۔ کسی قوم کے فرد نہیں۔

ہمارے جماعتی مفاد جماعت کے زیادہ سے زیادہ افراد کے ذاتی مفاد کے مترادف نہیں۔ قرآن و حدیث کے مفاد ہماری اُمت کے مفاد ہیں۔ چاہے اُن کی حفاظت میں جماعت کے تمام افراد کے کل ذاتی مفاد قربان ہو جائیں۔

بعض لوگ اُمت اسلامیہ کی تشکیل کی وضاحت کے لئے اُسے قوم کے بجائے پارٹی کے لفظ سے بیان کرتے ہیں، وہ اس کی مثال سوشلسٹ پارٹی سے دیتے ہیں۔ جہاں تمام مفاد ایک مقصد کے لئے کسی نظام یا مجموعۂ اصول کے ماتحت کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ مثال بھی من کل الوجوہ درست نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ سوشلسٹ پارٹی میں ہر شخص عقیدہ تبدیل کر کے شامل ہو سکتا ہے لیکن وہاں اصولاً یہ قید نہیں کہ توالد و تناسل میں بھی سوشلسٹ صرف سوشلسٹوں سے تعلق پیدا کریں۔ یا جن اعمال کا جماعت اور سوسائٹی سے تعلق نہیں ان میں کسی خاص اخلاقی معیار کو مدِ نظر رکھیں۔ چاہے عملاً کچھ سوشلسٹ ان اُمور میں بھی کسی ایک مسلک پر کاربند ہوں لیکن یہ سوشلزم کے اصول میں شامل نہیں۔ برعکس اس کے گو اسلام نسل کو اپنے راستہ میں رکاوٹ نہیں مانتا، لیکن خود ایک نسل پیدا کرنا چاہتا ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ اسلامی گروہ بندی اپنی مثال آپ ہی ہے۔ اس قسم کی کوئی اور گروہ بندی اس وقت روئے زمین پر نہیں، گو بعض خاص باتوں میں ہماری گروہ بندی کی مثال دوسرے گروہوں سے دی جا سکتی ہے۔ لیکن من کل الوجوہ کوئی دوسرا گروہ ایسا نہیں جو اُمت محمدی ﷺ جیسے خصوصیات رکھتا ہو۔

غرض ہم کوئی قوم نہیں۔ ہم تو خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت ہیں۔ یہی ہمارا طغرائے امتیاز ہے۔

اُمت اسلامیہ کی علت اور بنائے تشکیل:۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس اُمت کی علت تشکیل اور بنائے تشکیل کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نسل، ملک، اقتصاد، زبان، تمدن، تاریخ وغیرہ کی بنا پر جس قدر اُمتیں بنتی ہیں۔ دراصل یہ دیکھا جائے تو اُن کی بنا کسی حماقت یا خبط پر ہے۔ اس امر کا تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسانی زندگی میں نسل، ملک، اقتصاد، زبان، تمدن اور تاریخ سب اپنی اپنی جگہ حقائق کا رتبہ رکھتے ہیں۔ کوئی گروہ بندی ان حقائق کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ لیکن ان میں سے کسی ایک یا چند کو بنائے قوم قرار دے لینا، یا سب کو مجموعاً بنائے قوم قرار دیتے ہوئے بھی ان کی واقعی نوعیت، اہمیت اور اصلیت سے تجاوز کر جانا اگر حماقت اور خبط نہیں تو اور کیا ہے؟

درحقیقت ان تمام اور کائنات کے کل حقائق کی بنیاد انفرادی شخصیت ہے جو حقائق جماعتی زندگی میں رونما ہوتے ہیں وہ ابھی افراد ہی کے محتاج ہیں۔

اسلام نے فرد کو کسوٹی قرار دیتے ہوئے ان تمام حقائق کا عطر اور ست نچوڑ کر اپنی تعلیمات میں شامل کر لیا ہے۔ یہ تعلیمات اُمت اسلامیہ کی بنائے تشکیل اور ان پر اعتقاد علت تشکیل ہے۔

عناصرِ قومیت:۔

ایک گروہ، پارٹی، قوم یا اُمت کیا ہے؟ چند انسانوں کی ضروریات، خواہشات، یا میلانات کو پورا کرنے کی کوشش ہے۔ ہر انسان خوراک، پوشاک اور سر چھپانے کو جھونپڑا چاہتا ہے۔ یہ ہوئی اقتصادی زندگی کی بنیاد۔ جب پیٹ بھر جائے تو ہر انسان اپنی جنسی خواہشات کی تسکین کے لئے ایک خاندان چاہتا ہے۔ یہ معاشرتی زندگی کی بنیاد ٹھہری۔ جب کھانا بھی مل جائے اور گھر بھی بن جائے تو پھر خود اپنے اعمال اور اپنے گرد و پیش کے انسانوں کی کرنی میں نیک و بد کا امتیاز کرنے کی سوجھتی ہے۔ یہ اخلاقی زندگی کی بنیاد ہے۔ ان کے علاوہ جب فطرت انسانی اپنی کمزوری اور ناپائیداری کا احساس کرتی ہے تو ایک اپنے سے بلند ہستی، ایک اپنے سے بلند تصور، ایک اپنے سے زیادہ پائیدار حقیقت کی پرستش کی آرزو دل میں کروٹیں لیتی ہے۔ یہ رُوحانی زندگی کی بنیاد ہے۔ دل چاہتا ہے نیلے آسمانوں، بلند پہاڑوں، پُر اسرار بادلوں، وسیع میدانوں اور صحراؤں، بے پایاں سمندروں، کھلکھلاتے ہوئے پھولوں، گھر گھر کرتی ہوئی مشینوں، معصوم بچوں اور قبر میں پاؤں لٹکائے بڈھوں، ویران قبرستان اور آباد شہروں، خوشی کے نغموں اور غم کی

چیخوں، پیدائش کے گہواروں اور جنازہ کے جلوسوں کی تہ میں، ان سب پردوں کے پیچھے، ایک دائم وقائم، ہمیشہ رہنے والی سب پر غالب، سب کو بنانے والی، سب کو چلانے والی، نیکی اور بدی دونوں کی مالک لیکن دونوں سے منزا اور دونوں سے اوپر طاقت کا تصور کیا جائے۔ اپنے آپ کو اس کے سامنے مجتمع کیا جائے۔ پھر اس کے حضور سے سر اٹھا کر اپنی توجہ کو روزمرہ کی ضروریات میں بکھیرا جائے۔ یہ اجتماع اور افتراق، یہ نیند اور بیداری، زندگی میں وہی حیثیت رکھتے ہیں، جو ہر گھڑی سانس لینا اور چھوڑنا۔ جس طرح مختلف گروہ بندیوں میں اقتصاد یا اخلاق کا تصور مختلف ہوتا ہے۔ اسی طرح رُوحانیت کا احساس بھی مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ کوئی کائنات کی بنیادی طاقت کو نیچر کہتا ہے، کوئی انرجی پکارتا ہے، کسی کو دیوتاؤں کی فوج دکھائی دیتی ہے، کوئی عقل ہی کو اصل واساس قرار دیتا ہے، کوئی بھگتی کو عرفان تصور کرتا ہے لیکن اس طاقت کا انکار کوئی نہیں کرسکتا۔

غرض یوں ہر انسان کی شخصیت کے مختلف عناصر رُوحانیت کے مخصوص اعتقادات سے امتزاج پا کر کسی ایک قوم، پارٹی یا جماعت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

اُمتِ اسلامیہ اور قومیت کے تصورات اور مفہوم میں فرق:۔

سوال پیدا ہوتا ہے جب سب انسان یکساں ضروریات کے ماتحت گروہ بندی کرتے ہیں تو پھر یہ قوم، پارٹی اور اُمت کا فرق کیسا؟

فرق یوں ہے کہ تمام انسانی گروہ بندیوں میں اقتصاد اور معاشرت اور اخلاق اور سیاست اور دین کا امتزاج اور تناسب یکساں اعتدال سے نہیں ہوتا۔ کہیں اقتصاد غالب ہو جاتا ہے، کسی جگہ نسل بقیہ عناصر پر چھا جاتی ہے، کبھی گروہ بندی بجائے خود ذریعہ سے بڑھ کر مقصد نظر آنے لگتی ہے اور علیٰ ہذا القیاس، پھر وہ گروہ بندی کے مذکورہ بالا عناصر میں سے بھی ہر ایک کی نوعیت اور کیفیت ہر گروہ میں یکساں نہیں ہوتی۔ امریکہ میں بھی اقتصاد ہی زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر غالب ہے لیکن اس کی شکل رُوس کے اقتصاد سے قطعاً مختلف ہے۔ اسلام اور ہندومت دونوں میں رُوحانیت نے گروہ بندی کا قالب ڈھالا ہے لیکن دونوں کا رُوحانیت کا تصور مختلف ہے۔

غرض اصولاً تو دُنیا کے تمام گروہ اور تمدن، قومیں اور اُمتیں، اقتصاد، معاشرت، اخلاق، سیاست، دین اور شریعت سے ہی مل جل کر بنی ہیں لیکن کہیں اقتصاد غالب ہے اور کہیں دین مغلوب۔ کہیں سیاست زیادہ ہے اور کہیں معاشرت کم۔ ان مختلف عناصر کے مختلف جوڑ توڑ اور پھر

ہر ایک عنصر کے مختلف اجزائے ترکیبی کی مخصوص ترتیب سے کسی انسانی گروہ بندی کی جو مجموعی ہیئت کذائی بنتی ہے اُسے حسب حیثیت قوم اُمت یا پارٹی کا نام دیا جاتا ہے۔

پارٹی ان تینوں میں سے کمزور ترین رشتہ کا نام ہے۔ پارٹی کسی خاص فعل میں کچھ میعاد کے لئے محض اتحادِ عمل کا نام ہے۔ یہ واضح ہے کہ محدود سے محدود اتحادِ عمل کے لئے بھی ایک حد تک اتحادِ عقائد لازم آتا ہے۔ جب صدہا سال تک ایک ہی پارٹی میں باہمی توالد و تناسل سے خوراک، پوشاک، زبان، اخلاق، رسوم ورواج، عادات اور شکلیں گھس پٹ کر یکساں ہو جائیں اور یہ خصوصیتیں خون میں شامل ہو جائیں تب ایسا گروہ ایک قوم کہلانے لگتا ہے۔ لیکن پارٹی اور قوم دونوں میں دینی اتحاد شرط نہیں۔ پارٹی میں تو باہمی ازدواج کی بھی قید نہیں۔ قوم میں ازدواج اکثر قوم کے اندر ہوتا ہے لیکن باہر بھی ہو جائے تو کچھ ایسا ہرج نہیں۔

اب باری آتی ہے اُمت کے مفہوم کی وضاحت کی۔ یہ ایک انوکھا، نرالا اور اچنبھا رشتہ ہے۔ ایک لحاظ سے قوم اور پارٹی دونوں سے زیادہ وسیع اور پائدار اور دوسرے پہلو سے دونوں سے زیادہ نازک اور پادر ہوا۔ اس کی ابتداء بیت المقدس کے قرب وجوار میں بنی اسرائیل کے پیغمبروں کے ذریعہ ہوئی۔ جب باقی کی دُنیا اہرمن ویزداں اور لاتعداد دیوی دیوتاؤں کے چکر میں پڑی تھی تب یہود کے انبیاء جنہیں ہم بھی تسلیم کرتے ہیں انسانی گروہ بندی کی تاریخ میں ایک نیا باب کھول رہے تھے۔ جہاں خداؤں کے بجائے، ایک اللہ جل شانہٗ اور قوموں کے بجائے ایک اُمت کے تصور کی بنیاد اتحادِ عقائد اور اتحادِ اعمال پر رکھی جا رہی تھی۔ انسان کی سرگزشت اور ترقی میں یہ پہلا موقع تھا کہ کائنات کا ٹکڑہ ٹکڑہ طاقتوں کے بجائے ایک ہمہ گیر رضا کی تخلیق تسلیم کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی پہلا موقع تھا کہ انسان نے جو آج تک اپنے تئیں بھانت بھانت کے جانوروں کی طرح شعوب وقبائل اور اقوام میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بٹا ہوا مانتا تھا، نسل اور زبان کو ناقابلِ عبور حد بندیاں مانا کرتا تھا، سانجھے معبود کے تصور سے متاثر ہو کر، ایک عالمگیر اخوت کا احساس کیا۔ آج سے مختلف نسلوں، مختلف زبانوں اور مختلف ملکوں کے لوگ بھی ایک رب جل شانہٗ پر ایمان لا کر اور ایک نبی کی شریعت اختیار کر کے ایک مشترک اقتصاد، مشترک معاشرت، مشترک اخلاق، مشترک رسوم ورواج، مشترک عبادات، مشترک قانون اور مشترک سیاست اختیار کر سکتے تھے۔ شاید بنی آدم کی تاریخ میں ہی اخلاقی اور آنے والے دور کی امکانی فضیلت ہے جس کی بنا پر قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ بار بار بنی اسرائیل پر احسان جتاتا ہے کہ "دیکھو میں نے تمہیں دُنیا کی تمام قوموں پر بزرگی دی، میری یہ نعمت بھول کر ناشکری کے مرتکب نہ ہونا"۔

غور سے دیکھیں تو قوم و اُمّت کے تصورات کے ارتقاء میں انسانی نفسیات کے اعلیٰ اور ادنیٰ مَلکے بھی کارفرما نظر آتے ہیں۔ انسانی ذہن میں سب سے ادنیٰ کاروائی خارجی طور محسوسات اور داخلی طور پر اوہام وخواہشات ہیں۔ اعلیٰ ترین نفسیاتی فعل ارادہ یا رضا ہے جو داخل اور خارج دونوں پر حاوی ہے۔ یہیں مادہ اور رُوحانیت کے ڈانڈے مل جاتے ہیں۔ محسوسات وخواہشات اور ارادہ یا رضا کے درمیان اوسط درجہ کے نفسیاتی اعمال آتے ہیں، مثلاً تصورات، جذبات، حافظہ وغیرہ۔ اس نگاہ سے دیکھیں تو قومیت اوہام وخواہشات، نسلی جذبات اور حافظہ کا مرکب ہے۔ برعکس اس کے اُمّت سرتاپا ارادی تخلیق ہے۔ اُمّت کے نظام میں خواہشات، اوہام، محسوسات، جذبات اور حافظہ بھی رضا کی روشنی میں ڈھل کر پھر ایک واضح مقصد کے لئے اپنی اپنی جگہ رکھ دیئے جاتے ہیں۔

ہر شخص جانتا ہے کہ ادنیٰ تخلیق مادی طور پر زیادہ ٹھوس، مضبوط اور پائیدار ہوتی ہے۔ اعلیٰ تخلیق گو بحیثیت مجموعی مضبوطی اور پائیداری میں بھی ادنیٰ پر ترجیح رکھتی ہے لیکن فوری اور محدود معنوں میں اس کی نزاکت اور لطافت ٹھوس نہیں ہوسکتی۔ پتھر کا کھردرا پن ہی اس کی مضبوطی ہے اور شیشہ یا چینی کی برتری ہی اس کی کمزوری بھی ہے۔ یوں قومیت خون، خبط اور شہوات واوہام سے مرکب ہونے کے باعث فرد کی رَگ رَگ میں سرایت کرجاتی ہے۔ قومی شیرازہ پریشان بھی ہوجائے تو قومیت بآسانی نہیں بکھرتی۔ اس کے اراکین ناخواندہ، جاہل اور منتشر بھی ہوجائیں تو ان کی شخصیت پر قومیت کے نقش مٹتے نہیں۔ یہیں دیکھ لو۔ راجپوت، جاٹ اور افغان تو متعین جن نسبتوں پر قائم تھیں اُنہیں ضائع ہوئے صدیاں گزر گئیں پھر بھی جب کوئی شخص یہ نسلی نعرے بلند کرتا ہے تو افسردہ رَگوں میں قومیت کا خون سرسرانے لگتا ہے۔ آریاؤں کو پراچین بھیتا کی یاد ستانے لگتی ہے۔ کالے کالے جسم بھی گورے گورے غرور کو یاد کرنے لگتے ہیں۔

برخلاف اس کے اُمّت کی ساری بُنیاد ہی شعور، ارادہ اور رضا پر ہے۔ یہاں کسی مصیبت سے ذرا جہالت اور ناخواندگی تسلط کرلیں، غفلت یا ضعف سے ایمان ڈھیلا پڑ جائے تو وہ بات ہی بگڑ جاتی ہے۔ دبے ہوئے خبط اور سدھری ہوئی شہوتیں پھر سے اُبھرنے اور بگڑنے لگتی ہیں۔ نظامِ اُمت کا سارا کاروبار منتشر ہوجاتا ہے وہ عبادتیں وہ شریعتیں، وہ علوم واصطلاحات، وہ نیک وبد کی تمیزیں سب اپنی اصلی شکل کھو کر مسخ ہوجاتی ہیں۔ جان نکل جانے کے بعد مُردے کے جسم کی جو حالت ہوجاتی ہے، شہر اُجڑ جانے کے بعد اُس کے کھنڈرات کی جو کیفیت ہوجاتی ہے، وہی حال اپنا ایمان بھولی ہوئی اُمّت کا ہوجاتا ہے۔

اُمّتِ اسلامیہ کی خصوصیات:۔

اُمت اسلامیہ کی بنا توحید پر ہے۔ ہماری گروہ بندی سر سے لے کر پاؤں تک وحدت کے تصوّر پر قائم ہوتی ہے۔ گروہ بندی کی ابتدا فرد اور اس کی ضروریات کے تصوّر سے شروع ہوتی ہے۔ ہم فرد کو ایک قائم بالذات حقیقت تسلیم نہیں کرتے۔ فرد بھی کائنات کی دیگر اشیاء کی طرح ایک مخلوق ہے، گو باقی تمام تخلیق سے برتر اور اس لئے اشرف المخلوقات۔ تمام کائنات اور خود حضرت انسان کی ہستی ارادۂ الٰہی (جل شانہٗ) یا رضائے الٰہی (جل شانہٗ) سے قائم ہے۔ دوسری طرف انسان بھی اضافی طور پر اپنے دائرہ کے اندر ایک اپنے ارادہ کا مالک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان رضائے الٰہی (جل شانہٗ) سے بخشی ہوئی طاقتِ ارادی سے منشائے الٰہی (جل شانہٗ) کے خلاف چل کر گناہ کا مرتکب ہوسکتا ہے۔ رضائے الٰہی (جل شانہٗ) سے مفہوم کائنات کی وہ طاقت ہے جو انسان کو ہست سے نیست کرسکتی ہے۔ منشائے الٰہی (جل شانہٗ) سے قدرت کے وہ احکام مراد ہیں جن کی پیروی اتباع سُنّت وشریعت نبوی ﷺ سے ممکن ہے۔ اگر رضائے الٰہی (جل شانہٗ) انسان کو قوتِ ارادی بخشی ہے تو منشائے الٰہی جل شانہٗ وہ ہدایت کا راستہ ہے جس کے رُخ پر اس قوتِ ارادی کو استعمال کرنے کا حکم ہے۔

انسانی شخصیت کے دائرہ کے اندر قوتِ ارادی پھر مختلف اجزاء میں بکھر کر ظاہر ہوتی ہے۔ حاجتیں ہیں، آرزوئیں ہیں، اعمال ہیں، نیتیں ہیں۔ اسلام کا تقاضا ہے کہ چوبیس گھنٹے قوتِ ارادی کے اُن تمام مظاہروں میں یکجہتی اور یکسوئی کی توحید ملحوظ رہے۔

فرد کا یہ تصوّر لے کر اسلام جو اجتماعی نظام تعمیر کرتا ہے، اُسے ہم اُمّت کہتے ہیں۔

دراصل تمام فلسفہ اور علم، حقائق کے لئے اصطلاحات وضع کرنے کا نام ہے۔ اسلام کی مذکورہ بالا دینی اصطلاحات کی دوسری تمام رائج الوقت تمدّنی اصطلاحات پر ایک بدیہی برتری یہ ہے کہ اسلامی اصطلاحات دوسری تمام اصطلاحات پر حاوی ہیں اور ان کا تجزیہ کرسکتی ہیں۔ برعکس اس کے قوم یا پارٹی کا تصوّر اور اُن کی تمدّنی اصطلاحات اُمّت کے مفہوم اور اسلامی اصطلاحات کا پورا پورا تجزیہ کرنے سے قاصر ہیں۔

فی زمانہ بین الاقوامی اخوّت کی حاجت اور اُمّتِ اسلامیہ:۔

آج دُنیا میں جب کبھی بین الاقوامی اخوّت کا سوال اُٹھتا ہے تو سب سے بڑی دقت یہ پیدا ہوتی ہے کہ ایک گوری وحشی پڑھی لکھی اور با اقتدار قوم کو عقل کے کس تصوّر سے کالے کلوٹے،

گھامڑ حبشیوں کے مساوی بنایا جائے۔ بغیر کسی نہ کسی شکل میں مساوات کے تصور کے اخوت پیدا نہیں ہو سکتی۔ قومیت کے دائرہ کے اندر یہ مساوات قوم کی رکنیت کی صورت میں رائج ہوتی ہے۔ سوشلزم، یہ اخوت، اقتصادی مسائل میں مہیا کرنے کا مدعی ہے۔ دونوں میں کچھ دقتیں ہیں۔ قومیت کی مساوات رکنیت اپنے دائرہ کے اندر تو ضرور مسئلہ حل کر دیتی ہے لیکن ساتھ ہی قومیت کے دائرہ کے باہر عدم مساوات کا زبردست مسئلہ کھڑا کر دیتی ہے، کیونکہ قومیت کا تصور ہی اپنی علیحدگی پر مبنی برتری پر قائم ہے۔ اقتصادی مساوات ناممکن العمل ہے۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ محنتی اور کاہل الوجود مساوی بہبود کے مستحق قرار دیے جائیں۔ یہ مساوات خلاف انصاف اور خلاف حقائق ہوگی۔ کوئی نظام جو اس قسم کی مساوات عائد کرنے کی کوشش کرے گا، پائیدار نہیں ہو سکتا۔ انسان انصاف اور حقیقت کو نظر انداز کر سکتا ہے، چل بھی سکتا ہے لیکن ہمیشہ کے لئے نہیں۔

بین الاقوامی اخوت کے لئے ایک ایسی مساوات کا تصور درکار ہے جو نہ صرف ہر انسان پر منطبق کر دیا جائے بلکہ جس کا مستحق بننے کے لئے ہر انسان اپنی موجودہ حالت میں استعداد بھی رکھتا ہو۔ ذہن انسانی اس وقت تک کوئی ایسی منطق ایجاد کرنے سے عاجز رہا ہے جس سے "عالمگیر انسانی برادری" کے لئے بھائی چارہ کی کوئی قدر مشترک معین ہو سکے۔ وجہ یہ کہ انسانی ذہن یہ مطلوبہ وجۂ اشتراک ہمیشہ اپنی حدود کے اندر رہ کر تلاش کرتا ہے، حالانکہ عالمگیر اخوت کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ ذاتی حدود سے اوپر اٹھا جائے۔ یہ تقاضا کسی انسان سے برتر عقل کی پرستش سے ہی پورا ہو سکتا ہے۔ اسلام وہ نایاب صفت، تقویٰ کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ انسان کا موجودہ رنگ یا عقل اس کی اصل نہیں کیونکہ دونوں امتداد زمانہ، جغرافیائی تبدیلیوں اور خوراک یا تربیت سے بدل سکتے ہیں۔ انسان کی اصل اس کے ارادہ کا رُخ ہے۔ اس کے وجود کی حقیقت کی اپنے خالق سے نسبت ہے۔ یہی تقویٰ ہے۔ ارادہ کج ہوا تو سفید رنگت اور روشن عقل دونوں پر سیاہی پھر جائے گی اور ارادہ اُجلا ہے تو دل کا نور منہ پر بھی چمکنے لگے گا۔

یہ ہے وہ امکانی مساوات جس کے ذریعہ اسلام کل عالم کی بین الاقوامی اخوت کے پرانے خواب کو ایک حقیقت بنا دیتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ نسل، نسب، تربیت، استعداد اور وطن کچھ حیثیت ہی نہیں رکھتے۔ اسلام ان تفاوتوں کو تسلیم کرتا ہے لیکن مساوات کے لئے راستہ کھلا چھوڑ کر۔

☆☆☆

تسخیرِ عالم و تسخیرِ کائنات ہمارا ہی مقدر ہے!

انسان کی ترقی کی تاریخ اس کے گرد و پیش اور ماوراء کی تسخیر کی تاریخ ہے۔ آدم علیہ السلام نے زراعت سے خورد و نوش کی پیداوار تسخیر کی تو نوح علیہ السلام نے سمندروں پر جہاز چلایا۔ سلیمان علیہ السلام نے ہوا پر قابو کیا تو داؤد علیہ السلام نے نغمہ اور فولاد کو مسخر کیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے معاشرتی قانون میں تنظیم کی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے رفع امراض کا اہتمام کیا۔

قرونِ سلف میں رُوحانیات پر زیادہ توجہ تھی۔ گزشتہ تین سو برس میں فرنگ کے غلبہ کی داستان سائنس یعنی مادی اور دنیاوی علوم سے مادہ کی تسخیر کی داستان ہے۔ بارود کی دریافت سے آتشیں ہتھیار ان لوگوں کے ہاتھ کیا آئے، بندر کے ہاتھ اُسترا آ گیا۔ ایک عالم کو ان کی چیرہ دستیوں نے لہولہان کر دیا۔ آج کل اپنے خویش و اقربا کا بھی گلا کاٹنے میں مصروف ہیں۔ پھر دخانی انجن ان کے قابو چڑھا تو ساتوں سمندروں پر اچھلنے لگے۔ منطق اور فزکس (علم طبیعات) اس تمدن کی بنیاد تھے۔ اس مذہب کے ربِ اکبر تھے حضرت ذرۂ عظیم جل جلالہ۔ اب دوسری عالمگیر جنگ میں ذراتی بم کے کشف سے حضرت ذرۂ عظیم بھی تڑاق سے پھٹ گئے ہیں۔ ہماری آنکھوں نے ان کا اندر باہر دیکھ کر اُن کا عرفان حاصل کر لیا ہے۔ دیکھا تو یہ دیکھا کہ فرنگ کا معبود بھی پتھر کی قدیم مورتیوں کی طرح مٹ جانے والا ہے۔ اس کی ذات اور صفات بھی کسی اور ہی ارادہ سے قائم ہیں۔

تسخیر نام ہے جان لینے کا۔ کسی چیز کا علم حاصل کر لینا ہی اُسے مسخر کر لینا ہے۔ فرنگ نے ذرہ کا علم حاصل کر لیا۔ اس لئے ان کا سائنس آج جہاں تک مادہ پر عوام کی نظر جاتی ہے محیط ہے۔ مگر وہ نفسِ انسانی کی حقیقت نہ سمجھ سکے اور اس لئے باوجود ذراتی بم کے کوئی عالمگیر اخلاق یا امن قائم کرنے سے عاجز ہیں۔ جہالت ہی عاجزی ہے۔ پھر وہ اس پُر اسرار اور دائم و قائم قوت کی حقیقت سے بھی نابلد ہیں جو ذرہ کو توڑنے اور جوڑنے والی قوتوں کے پیچھے کارفرما ہے۔ اس لئے وہ اس کو راضی کرنے یا اس کی ناراضگی سے بچنے کا ٹوٹکا بھی نہیں جانتے۔ جب وہ انسان کی حقیقت سے بھی جاہل ہیں اور انسان کے گرد و پیش کی کائنات کی اصلیت سے بھی ناواقف ہیں، اور ان دونوں کی حقیقت اور اصلیت کے باہمی رشتہ کی تہہ کو بھی نہیں پہنچ سکتے اور ان تینوں کے پیچھے دائم و قائم ازلی و ابدی قوت سے بھی ناآشنا ہیں اور اس قوت کو اپنے موافق یا ناموافق کرنے کے دستور سے بھی محروم ہیں تو بتاؤ وہ تسخیرِ نفس، تسخیرِ کائنات یا تسخیرِ حقیقت میں کیسے کامیاب ہونے

کی اُمید رکھ سکتے ہیں۔

برعکس اس کے ہم مسلمان جانتے ہیں کہ علم نہ صفات ہے نہ جذبات۔ علم تو بس ارادہ ہے۔ صفات خالی اصطلاحات ہیں اور جذبات فقط مایۂ اعمال۔ حقیقتِ ذات اِن دونوں سے ماوراء ہے اور وہ رضا، قضا اور مشاء کے سوا کچھ نہیں۔

علم کا یہ تصور لے کر ہم نفسِ انسانی کو بھی سمجھ سکتے ہیں اور مسخر کر سکتے ہیں۔ کائنات کی حقیقت بھی ہمارے سامنے واشگاف ہے اور اس کی طاقتیں بھی ہم تسخیر کر سکتے ہیں یہ تو کیا حقیقتِ حق اور رضائے الٰہی (جل شانہٗ) بھی ہماری دسترس میں ہے۔

واضح ہے کہ پاکستان کا تمدن توحید پر مبنی ہوگا۔ شرک سے مبرّا ہوگا۔ وہاں زندگی اور علم کی بنا، رضا، قضا اور مشاء پر ہوگی۔ اس لئے وہاں زندگی بھی مسخر ہوگی اور موت بھی مسخر ہوگی۔ دُنیا و عقبیٰ کی دولتیں حاصل ہوں گی۔

دولتِ پاکستان بجا طور پر دعویٰ کر سکے گی کہ تسخیرِ عالم و تسخیرِ کائنات ہمارا ہی مقدّر ہے۔

☆/☆/☆/☆

زندگی اور موت ایک دوسرے سے مُرکب ہیں:-

(۱) تنفس (سانس لینا اور چھوڑنا)۔
(۲) انہضام (کھانا اور فاضل خارج کرنا)۔
(۳) اوررار (پینا اور فاضل خارج کرنا)۔
(۴) ہوش (سونا اور جاگنا)۔
(۵) حسیات (محسوس کرنا اور نظر انداز کرنا)۔
(۶) ایمان (اقرار کرنا اور انکار کرنا)۔
(۷) معیشت (کمانا اور خرچ کرنا)۔
(۸) جنسیات (حجاب اور بے حجابی)۔
(۹) تعلق (محبت اور نفرت)۔
(۱۰) اعمال (تعمیر اور تخریب)۔
(۱۱) عدم وجود (ہونا اور نہ ہونا)۔
(۱۲) نفی اثبات (ماننا اور نہ ماننا)۔
(۱۳) انکار و اقرار (تسلیم و اعتراض)۔
(۱۴) اخراج و انجذاب (شمولیت و اخذیت)۔
(۱۵) ردّ قبول (لینا اور نہ لینا)

☆/☆/☆/☆

پاکستان کے سامنے روس، امریکہ اور انگلستان ہیچ ہوں گے!!

آج دُنیا میں تین سلطنتوں کا بول بالا ہے۔ روس اپنی وسعت، مشرق و مغرب میں پوزیشن اور اعتقادی خصوصیات کے باعث دُنیا کی بڑی قوت ہے، امریکہ اپنی صنعتی برتری، اقتصادی طاقت اور مال خام کی بہتات سے دُنیا کی بڑی قوت ہے، برطانیہ اپنی عالمگیر سلطنت، ضرب المثل تدبر اور تاریخی روایات کے بل بوتے پر دُنیا کی بڑی طاقت ہے۔ لیکن حقیقت کی نظر سے دیکھو تو یہ تینوں نظام اندر سے کھوکھلے ہیں۔ تینوں کی بنیاد پاجی پن، حرص، دغا اور ظلم پر ہے۔ بنی آدم نے اس نظام کی بنیاد اس لئے نہ رکھی تھی کہ چند بدنیت مکّار، بہت سے بھولے اور کمزوروں پر اپنا ناجائز تسلط جتایا کریں۔ لیکن جب گاڑی چل پڑتی ہے تو خود گھوڑے کو اس کا تھامنا ممکن نہیں رہتا۔ حالانکہ اس کے پہیے اسی کی قوت سے گردش کر رہے ہوتے ہیں۔ یہی حال آج دُنیا کے عوام کا اس ظلم کی تین پہیوں والی گاڑی کے سامنے ہے، جس کی باگیں روس، امریکہ اور انگلستان کے ہاتھ میں ہیں۔

سلطنت پاکستان جغرافیائی لحاظ سے دُنیا میں ایک ایسی مرکزی حیثیت میں ہوگی کہ کیا جغرافیائی لحاظ سے اور کیا تجارت کی غرض سے دُنیا کی اور کوئی طاقت اس کا لگا نہ کھا سکے گی۔ توحید کا عقیدہ اور شرک سے انحراف ایک ایسا نعرہ ہے، جس کی صدائے بازگشت پانچوں برِاعظموں کے مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن سے سنائی دے گی۔ دُنیا کی دبی ہوئی مخلوق اس کے سینے کے نقارے سے بجنے والی نوبت پر لبیک کہے گی۔ فرنگ نے انیسویں صدی میں سمندر کی لہروں پر قبضہ کر کے دُنیا میں عروج حاصل کیا تھا، ہم فضا کی پہنائیوں پر تسلط کر کے ذراتی قوت، شعاعی قوت، برقی قوت اور سب سے بڑھ چڑھ کر ارادی قوت سے دُنیا کے ایک ایک دروازہ پر دستک دیں گے کہ ظلم و استبداد کے قصر لرز اٹھیں گے۔ ہماری یلغار تکلّم کو نہ قلعے روک سکیں گے نہ تجارتی حد بندیاں۔ دشمنوں کے دماغوں کے اندر ہمارا ساتواں کالم کام کرے گا۔ ہمارا استدلال انسان کی اس آٹھویں حس کو مسخر کرے گا جس کا نام ارادہ ہے۔

پاکستان کی اس تازہ دم اور منجھی ہوئی طاقت کے سامنے روس، امریکہ اور انگلستان ہیچ ہوں گے۔ ان کا وہی حشر ہوگا جو روما کے سامنے یونان کا ہوا تھا جو انگلستان کے سامنے سلطنت عثمانیہ کا ہوا تھا اور جو امریکہ کے سامنے انگلستان کا ہو رہا ہے۔

خاتمہ

الحمدللہ کہ حضرت بابا بلند کوہی زاہلستانی دام اللہ فیوضھم کے نفوس قدسیہ کی برکت سے ہم یہ امانت مسلمانانِ ہند کی خدمت میں پہنچا دینے کے فرض سے عہدہ برا ہوئے۔

الحق پاکستان کا قیام اہل اللہ (جل شانہٗ) کے توجہائے نیم شبی ہی کا محتاج ہے۔ اسلام کا جھنڈا جو حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری علیہ الرحمۃ نے پانچویں صدی ہجری اور گیارھویں صدی عیسوی میں لاہور میں گاڑا، جسے خواجہ خواجگان خواجہ غریب نواز حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہٗ العزیز نے اقصائے ہند پر محیط کر دیا اور جسے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت بابا فرید الدین شکر گنج، حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی، حضرت خواجہ نصیر الدین روشن چراغ دہلی اور امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین نے اپنے اپنے اوقات میں سر بلند رکھا، مسلمانانِ ہند کی کم بختی اور بدبختی سے گزشتہ اڑھائی سو سال سے کسی علمبردار کا منتظر ہے۔

ہماری شامتِ اعمال نے ہمیں کسی مردِ خدا کی رہنمائی سے محروم کر دیا۔

آؤ آج اپنے سنگلاخ دلوں کو پگھلا کر بارگاہِ رب العزت جل شانہٗ میں لجاجت کریں کہ وہ اس شقاوت کا پردہ ہم سے دور کر دے۔ ہمیں توفیق دے کہ ہم پھر خلافتِ محمدی ﷺ کے مستحق بن جائیں۔

تمت بالخیر

☆/☆/☆/☆

اظہارِ تشکر

اس کتاب کی طباعت واشاعت کے لئے مندرجہ ذیل حضرات گرامی نے "مالی تعاون" فرمایا۔ اللہ کریم جل شانہٗ وجلالہٗ ان سب کرم فرماؤں کو جزائے خیر سے نوازے اور دین ودُنیا اور آخرت میں کامیابی وکامرانی سے سرفراز فرمائے۔ اُمید ہے کہ ان سب گرامی قدر حضرات کا "مالی تعاون" جاری وساری رہے گا اور یوں ایک دُنیا حضرت مجاہد ملت قدس سرہٗ العزیز کے افکار ونظریات، ملفوظات وتعلیمات اور فرمودات وارشادات سے مستفید ومستفیض ہوتی رہے گی۔ آمین ثم آمین (قصوری)

☆ جناب محترم ڈاکٹر خالد سعید شیخ، سیال کوٹ
☆ جناب محترم نوابزادہ محمد علی خان ہوتی، مردان
☆ جناب محترم کرنل (ر) ڈاکٹر رشید احمد، راولاکوٹ (آزاد کشمیر)
☆ جناب محترم میاں سرتاج عزیز سابق وزیر خارجہ، لاہور
☆ جناب محترم عدنان کریم جسکانی، ڈیرہ غازی خاں
☆ جناب محترم ڈاکٹر طارق محمود احمد، منڈی بہاء الدین
☆ جناب محترم شیخ طاہر انجم ملتان روڈ، لاہور
☆ جناب محترم حاجی محمد اسلم روکھڑی، میانوالی
☆ جناب محترم حاجی محمد الیاس، ملتان روڈ، لاہور
☆ جناب محترم زاہد اسلم چوہدری، سیالکوٹ
☆ جناب محترم صوبیدار میجر فضل کریم، راولپنڈی
☆ جناب محترم محترمہ عزیزہ وزد شہوار، اٹک
☆ جناب محترم عتیق ڈینٹل کلینک، ملتان
☆ جناب محترم خواجہ عبدالغنی باندے، راولپنڈی
☆ جناب محترم سردار پرویز احمد، میانوالہ، (قصور)
☆ جناب محترم غلام قادر قدسی، جھنگ
☆ جناب محترم ماسٹر محمد شیر، بچھاں (میانوالی)

☆ جناب محترم حاجی محمد ممتاز خاں نیازی، میانوالی
☆ جناب محترم ملک محمد شیر، فیصل آباد
☆ جناب محترم امین اللہ شیخ، راولپنڈی صدر
☆ جناب محترم علامہ تابش قصوری، مریدکے، شیخوپورہ
☆ جناب محترم قاضی محمد ریاض قریشی، علی پور فراش، اسلام آباد
☆ جناب محترم محمد زاہد خاں کلرک محکمہ زراعت، میانوالی
☆ جناب محترم مخدوم محمد سعید اسدی، میانوالی
☆ جناب محترم نثار احمد میر القادری الشاذلی راولپنڈی
☆ جناب محترم محمد اقبال انجم، کاموکے، گوجرانوالہ
☆ جناب محترم صوبیدار حاجی فضل الرحمٰن، ملتان
☆ جناب محترم راؤ محمد اکرم رضوی، وہاڑی
☆ جناب محترم الحاج غلام محمد، ساہیوال
☆ جناب محترم محمد اختر مبارکپورہ، سیال کوٹ
☆ جناب محترم محمد یونس نوشاہی، حافظ آباد
☆ جناب محترم نظام الدین نقشبندی، چونکی، قصور
☆ جناب محترم حسن رضا سردار کاموکے، گوجرانوالہ
☆ جناب محترم قاری منظور الٰہی چشتی، راولپنڈی
☆ جناب محترم حاجی تاج خان نیازی، میانوالی
☆ جناب محترم ڈاکٹر خورشید علی، فیصل آباد
☆ جناب محترم محمد فرخ اقبال چکڑالہ، میانوالی
☆ جناب محترم رانا محمد خورشید ایڈووکیٹ مظفر گڑھ
☆ جناب محترم پروفیسر سید محمد رضا زیدی، لاہور کینٹ
☆ جناب محترم عتیق الرحمٰن خان، راولپنڈی
☆ جناب محترم عبدالحمید ڈوگر، ساہیوال
☆ جناب محترم علامہ سعید احمد مہروی، لودھراں
☆ جناب محترم السید بدر السلام ہاشمی، چکوال

☆ جناب محترم حکیم رشید احمد، قصور
☆ جناب محترم محمد نجیب اللہ قریشی، میانوالی
☆ جناب محترم محمد یوسف فاروق، وزیر آباد
☆ جناب محترم محمد اقبال S.D.O رسالپور کینٹ
☆ جناب محترم امجد ظلیل سرہند کالونی، وہاڑی
☆ جناب محترم خالد اکرام قریشی، سیالکوٹ
☆ جناب محترم خالد جاوید خان نیازی، فیصل آباد
☆ جناب محترم سعید اختر خان نیازی، راولپنڈی
☆ جناب محترم پروفیسر غازی علم الدین، میرپور (آزاد کشمیر)
☆ جناب محترم چوہدری جان محمد حوالدار پنجاب پولیس
برج کلاں - قصور







جملہ اہلِ اسلام سے اپیل ہے کہ اگر آپ کے پاس ضیغمِ اسلام بطلِ حریت مجاہدِ ملت حضرت مولانا محمد عبدالستار خان نیازی رحمۃ اللہ علیہ کی کوئی، تحریر، خط، حوالہ، رقعہ، یادداشت، اخباری مضمون یا تراشہ، کتاب، تاثرات و مشاہدات یا خطابات کی آڈیو/ وڈیو کیسٹ ہو تو براہ کرم ہمیں ارسال فرمائیں تاکہ ہم ان چیزوں کو کتابی شکل دے کر حضرت مجاہدِ ملت قدس سرہ العزیز کے نظریات و افکار کو پھیلا سکیں۔

نیز ہمارے ساتھ ''مالی تعاون'' بھی فرمائیں تاکہ یہ سلسلۂ عشق و محبت جاری رہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دین و دنیا میں سرفراز فرمائے اور سعادتِ دارین سے نوازے۔ آمین

دعا گو

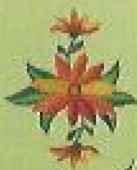
محمد صادق قصوری

بانی و صدر

مجاہدِ ملت فاؤنڈیشن پاکستان

برج کلاں ضلع قصور

پوسٹ کوڈ: 55051





PRINTED BY:

Malik Mahboob ur Rasool Qadri

ISLAMIC MEDIA CENTRE LAHORE

0321/0300-9429027, 042-37214940

mahboobqadri787@gmail.com